شہیدِ اعظمؑ

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی

پی۔ایچ۔ڈی

امامیہ مشن پاکستان ٹرسٹ
۳۲۔بی شمع پلازہ ۲۷، فیروز پور روڈ، لاہور

45
S
12A

MOASSESAH AL IMAM KHOMEINI TRUST (REGD)
کتابخانہ امام خمینی

MOASSESAH AL IMAM KHOMEINI TRUST (REGD)
کتابخانہ امام خمینی

شہیدِ اعظم علیہ السلام

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی
(پی۔ ایچ۔ ڈی)

امامیہ مشن پاکستان ٹرسٹ
۳۳/بی شمع پلازہ، ۲۷ فیروزپور روڈ، لاہور

بار چہارم ———— ایک ہزار
سال ———— ۱۹۹۸ء
مطبع ———— رضا سنز پرنٹرز، شمع پلازہ
فیروز پور روڈ — لاہور
ناشر ———— امامیہ مشن پاکستان، رجسٹرڈ، لاہور
سرورق ———— سیّد علی رضاؔ

ہدیہ ————

-: ملنے کے پتے :-

۱- امامیہ مشن پاکستان ٹرسٹ، ۳۳/ بی شمع پلازہ فیروز پور روڈ، لاہور۔
۲- افتخار بک ڈپو، مین بازار، اسلام پورہ، لاہور۔
۳- رضا سنز پرنٹرز، شمع پلازہ، فیروز پور روڈ، لاہور۔

ترتیب

عرض ناشر	۵
پیش لفظ	۷
شہیدِ اعظمؑ	۹
پہلا تعارف	۱۵
مجسّمۂ حق	۲۳
حقیقی فاتح	۲۹
اندازِ جنگ	۳۷
حق آگاہ خواتین	۶۳
کمسن مجاہد	۷۵
حسینیؑ شیر	۸۳
جواں مرد بوڑھے	۹۹
شہادت کے بعد	۱۱۷
مکّہ اور مدینہ کی تاراجی	۱۳۵
انتقام	۱۳۹
فخرِ آدمؑ	۱۴۵
آنسو	۱۵۳

غمِ حسین علیہ السّلام	۱۶۱
عزا داری	۱۶۵
بغاوت	۱۷۹
جہاد	۱۸۷
ضِد	۱۹۱
وضعی حدیثیں	۲۲۹

عرضِ ناشر

شہیدِ اعظمؒ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی مرحوم کی معرکتہ الآرا اور منفرد طرزِ ادا پر مبنی کتاب ہے، جسے امامیہ مشن پاکستان چوتھی بار شائع کر رہا ہے۔ اِس سے قبل مرحوم کی ایک اور نادر و نایاب کتاب "فتحِ مُبین" امامیہ مشن نے شائع کی تھی، جسے ملک کے اہلِ علم حضرات نے بے حد سراہا تھا۔ ڈاکٹر فاروقی مرحوم کی تحریر صاف و سادہ ہے اور اندازِ بیان استدلالی ہے۔ انھوں نے خود تحریر کیا ہے کہ واقعۂ کربلا کا تعلّق روایت سے نہیں بلکہ درایت سے ہے۔ اس واقعے کے بیان میں کسی فلسفیانہ موشگافی یا عالمانہ تحقیق و تدقیق کی ضرورت نہیں۔ اصل حقائق سے آگاہی ہی سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں مرحوم نے بڑے فاضلانہ انداز میں کربلا کی جنگ کے اسباب، امام حسینؑ کی سیاسی اور فقہی بصیرت، خواتین کی حق آگاہی، شہدائے کربلا کی جانثاری اور معصوم بچّوں کا شوقِ شہادت بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ ایک چھ ماہ کے بچّے کے خون نے واقعۂ کربلا میں حق اور باطل کا ایسا واضح امتیاز پیدا کر دیا، جسکے بعد حسینؑ کی حقّانیت اور یزید کی درندگی میں کوئی اشتباہ باقی نہیں رہا۔

امامیہ مشن کوئی سرمایہ دار ادارہ نہیں، اسکے وسائل بھی محدود ہیں، اس کے باوجود کتاب کی لاگت کے مقابلے میں قیمت فروخت کم سے کم رکھی گئی ہے تاکہ عام لوگ بھی اس کتاب سے مستفیض ہو سکیں۔ مجھے یقینِ کامل ہے کہ ایّامِ عزا کے دوران ہی یہ کتاب مومنین کے ہاتھوں میں پہنچکر ہماری جد و جہد اور ہماری آرزو کی تکمیل کر دے گی، والسّلام

(سیّد اخلاق حسین گردیزی)
مینجنگ ٹرسٹی امامیہ مشن پاکستان، لاہور

پیش لفظ

"شہیدِ اعظمؑ" کوئی مستقل تصنیف نہیں۔ صرف چند بکھرے ہوئے خیالات اور منتشر و پاشان تصوّرات کا مجموعہ ہے جسے محض اس لئے اشاعت کے لئے دے رہا ہوں کہ حضرت امام حسین علیہ السّلام کی محبّت کو ایمان جانتا ہوں۔ امام حسینؑ کی محبّت پہ نجات کا انحصار سمجھتا ہوں اور دل کے ہر گوشہ میں یہی تصوّر کارفرما ہے کہ اگر یہ ناچیز سعی قبول ہو گئی تو شاید یہ خاطی و آثم، گنہگار و سیہ کار، امام حسین علیہ السّلام کے صدقے میں عذابِ آخرت سے نجات پا جائے۔

تین سال ادھر کی بات ہے کہ محترمی محمد صدیق صاحب مدیرِ "رضا کار" کا خط آیا کہ محرّم نمبر کے لئے مضمون روانہ کرو۔ بدقسمتی سے اس زمانہ میں مَیں آنکھوں کی ایک ایسی بیماری میں مبتلا تھا کہ آنکھوں پر پٹیاں چڑھی ہوئی تھیں اور لکھنا پڑھنا تو درکنار، ہوش و حواس تک معطل تھے۔ مشکل یہ تھی کہ صدیق کا حکم نہ مانوں تو محبّت کے آبگینے درک جانے کا اندیشہ اور لکھنے بیٹھوں تو ساغرِ چشم کے بے نور ہو جانے کا خطرہ۔ مجبوراً ایک دوست کو بٹھایا، جو دل میں آیا، کہتا چلا گیا اور وہ لکھتے گئے۔ فرمائش مختصر سے مضمون کی تھی لیکن اچھی خاصی کتاب تیار ہو گئی۔ اب جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ مضمون اتنا طویل ہو چکا ہے کہ نمبر میں اس کی اشاعت کا امکان نہیں ہے۔ اس لئے اسے مجبوراً الماری میں ڈال دیا۔ وقت گزر گیا اور میں خود بھی اس مقالہ کے متعلّق سب کچھ بھول گیا۔

امامیہ مشن لاہور کا پنج سالہ پلان دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس مقالہ کی یاد آئی اور میں نے اس کی اطلاع ابرار حسین صاحب سیکرٹری امامیہ مشن لاہور کو دی۔ انھوں نے جواب میں تار دیا کہ فوراً کتاب بھیج دو۔ چنانچہ تعمیل حکم کر رہا ہوں اور محض اس جذبہ کے ماتحت کہ شاید یہ سطور بارگاہِ حسینیؑ میں مقبول ہو جائیں تو نجات کا سامان ہو جائے۔

اس کتاب کے سلسلہ میں بس یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس میں ایک عقیدت مند نے اپنی عقیدت کو فکر کی میزان میں تول کر اربابِ نظر کے سامنے پیش کیا ہے۔ واقعۂ کربلا کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے، اس کا تعلق روایت سے نہیں درایت سے ہے تاکہ غیر مسلم بھی اسے پڑھیں تو ہمارے نقطۂ نظر کی اصابت کو ماننے پر مجبور ہو جائیں۔ کتاب کے اصل مخاطب شیعہ نہیں ہیں، غیر شیعہ اور غیر مسلم ہیں جن کو واقعۂ کربلا سے روشناس کرانا مقصود ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ کتاب ہندو پاکستان کے ہندوؤں کے ہاتھوں میں پہنچے تاکہ وہ ایک نظر میں واقعۂ کربلا سے بھی آگاہ ہو جائیں اور عزاداری کے متعلق ہمارا نقطۂ نظر بھی سمجھ لیں۔ شیعوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ اس اعتبار سے مفید ہوگا کہ اس کو غیر مسلموں کے سامنے روادارانہ اور محبت آمیز انداز میں شیعی نقطۂ نظر پیش کرنے کا طریقہ معلوم ہوگا اور وہ دلائل ہاتھ آئیں گے جن سے وہ غیر مسلم اور غیر شیعہ حضرات کو شیعی نقطۂ نظر سمجھا سکیں گے۔

واقعۂ کربلا کے متعلق ہمارا نقطۂ نظر بہت سیدھا سادہ ہے اس میں نہ فلسفیانہ موشگافیوں کی ضرورت ہے اور نہ بہت عالمانہ انداز میں کتابوں کے حوالے دینے کی ضرورت، واقعہ بھی سیدھا سادہ ہے اور اس کا جو اثر ہم لیتے ہیں، وہ بھی فطری اور سادہ ہے۔ میں نے اسے

اسی سادگی سے پیش کر دیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اگر انصاف کی آنکھیں اور رواداری کے دل اس کتاب کا مطالعہ فرمائیں گے تو وہ یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوں گے کہ شیعوں پر عزاداری کے سلسلہ میں اعتراضات کرنا ایک فضول سی بات ہے۔ شیعوں کا نقطۂ نظر اس معاملہ میں منصفانہ بھی ہے اور عاقلانہ بھی۔ ضرورت بس اس کی ہے کہ ضد اور تعصّب کو دلوں سے دُور کر کے اسے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ میں نے یہ کوشش کی ہے کہ بڑے سادے انداز میں معاملہ کو پیش کیا جائے۔ خدا کرے کہ طالبانِ حق کے حلقہ میں یہ سعی قبول ہو۔

نیازمند

ذاکر حسین فاروقی مرحوم

ایم۔اے (پی۔ایچ۔ڈی)

شہیدِ اعظمؑ

اگر مجھ سے یہ سوال کیا جائے کہ،

" انسانی تاریخ کے ہزار دل نامور انسانوں میں تمہیں سب سے زیادہ عقیدت کس سے ہے" تو میرا ایک ہی جواب ہوگا ——————

حسینؑ سے!

سوال کیا جائے گا ———— "کیوں؟"

میرا جواب یہ ہے کہ ————

حسینؑ بڑے بہادر تھے۔ نپولین، سکندر، اور تیمور سے بھی زیادہ بہادر، ایسے بہادر کہ سر سے پیر تک زخموں سے چور ہو جانے، کلیجہ پر عزیزوں اور دوستوں کے بہتّر داغ سہنے، علی اکبرؑ کے سینہ سے برچھی نکالنے اور علی اصغرؑ کے معصوم خون کو چہرے پر مل چکنے کے بعد بھی ان میں اتنی طاقت موجود تھی کہ جب انھوں نے تن تنہا ۳۰ ہزار کے لشکر پر حملہ کیا تو فوج شام میں بھگدڑ مچ گئی۔ عرب کے بڑے بڑے سورما حسینؑ کی تلوار کی کاٹ مان گئے۔ اور جب تک علیؑ کے لال نے تلوار نیام میں نہیں رکھ لی تب تک دشمن ان کے قریب جانے کی ہمت نہیں کر سکے!

حسینؑ بڑے اللہ والے تھے، سچے خدا پرست، اور حقیقی عبادت گذار، اتنے عبادت گذار کہ انھوں نے برستے ہوئے تیروں میں نماز ظہر ادا کی، ان کا سر بھی اس وقت تن سے جدا کیا گیا، جب وہ اپنے پیدا کرنے والے کے حضور میں سجدہ ریز تھے۔ انھوں نے اللہ کی خاطر سب کچھ قربان کر دیا۔ عباسؑ کی بھرپور جوانی، علی اصغرؑ کی معصومیت،

اور زینبؑ کی چادر تک اپنے پالنے والے کی راہ میں لٹا دی اور اس طرح خدا کی راہ میں ایک ایسی بے مثال قربانی پیش کی، جس پر خدا پرستی کی تاریخ ہمیشہ ناز کرے گی!

حسینؑ بات کے بڑے دھنی تھے۔ انھوں نے اپنی جان دی اپنے کڑیل جوان بیٹے کی شہادت قبول کی۔ اپنے بھائیوں کو تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھا۔ اپنے چھ مہینہ کے بچہ کا ذبح ہو جانا برداشت کیا، اپنے دوستوں کو خاک و خون میں تڑپتے ملاحظہ فرمایا۔ اپنی بہنوں اور بیٹیوں کی اسیری و بے چارگی گوارا کی لیکن یزید کی بیعت نہ گوارا کرنا تھی نہ کی۔ انھوں نے جان دے کر آن رکھ لی اور یہ مردانگی کی تاریخ کا ایک ایسا شہ پارہ ہے جس پر نسل انسانی ابدالآباد تک ناز کر سکتی ہے۔

حسینؑ بڑے حق گو تھے۔ اموی سلطنت کا جاہ و جلال۔ شامی فوج کی برق تاب شمشیریں، سونے چاندی کے انبار، اکثریت کی بے پناہ طاقت اور آنکھوں کے سامنے ناچتی ہوئی موت بھی ان کو حق گوئی سے باز نہیں رکھ سکی چنانچہ کربلا کے میدان میں انھوں نے ایسی حق گوئی، بیباکی اور صداقت پر مشتمل تقریریں کیں جن سے دشمنوں کے دل لرز اٹھے شام کا ایوانِ حکومت کانپ گیا۔ اور آج بھی جب یہ خطبے پڑھے جاتے ہیں تو سننے والوں کے دل دہل جاتے ہیں۔

حسینؑ بڑے سخی تھے۔ چنانچہ جب حق نے ان سے زندگی کی بھیک مانگی تو انھوں نے بڑی خوشی سے اپنی، اپنے بچوں کی، اپنے عزیزوں کی اور اپنے دوستوں کی جانیں قوم کی جھولی میں ڈال دیں اور اپنا سب کچھ حق کی بقا کے لیے قربان کر گئے۔

حسینؑ بڑے اصول پسند تھے انھوں نے محض اصولوں کی خاطر ایک بڑی حکومت سے ٹکر لی، خوفناک اور فنا بدوش ٹکر، اور اس ٹکراؤ کے نتیجہ میں موت کا خیر مقدم کرتے ہوئے اپنے اصولوں کو حیاتِ جاودانی عطا کر گئے۔

حسینؑ بڑے صابر تھے، انھوں نے تین دن کی بھوک اور پیاس پر صبر کیا، حبیبؑ، مسلمؑ اور زہیرؓ کی موت پر صبر کیا، قاسمؑ کی لاش کی پامالی پر صبر کیا، عباسؑ کے شانے قلم ہونے پر صبر کیا، علی اکبرؑ کی جوان موت پر صبر کیا۔ علی اصغرؑ کی تشنہ دہانی پر صبر کیا، اپنے خیموں کے لٹنے اور اپنی عورتوں کی اسیری پر صبر کیا۔ انھوں نے ہر مصیبت کا خندہ پیشانی

سے مقابلہ کیا نہ اُن کے قدموں میں لغزش پیدا ہوئی اور نہ ان کی آنکھوں میں آنسو چھلک سکے۔ وہ ایک کے بعد ایک قربانی پیش کرتے رہے۔ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے رہے اور صبر کی ایک ایسی مثال پیش کر گئے، کہ آج تک صبر حسینی ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔

حسینؑ بڑے ایثار پسند تھے۔ انھوں نے خود پیاسا رہنا قبول کیا۔ اور دشمن کی فوج کو پانی پلا دیا۔ انھوں نے اپنا بھرا پُرا گھر لٹا دیا اور قوم کو تباہی سے بچا لیا وہ خود مر گئے لیکن اپنے مذہب کو حیاتِ دائمی عطا کر گئے۔ انھوں نے اپنا سب کچھ لٹا دیا لیکن انسانیت کے خزانے کو مالا مال کر گئے۔ اور آج اس حقیقت سے انکار محال ہے کہ حسینؑ نے کربلا کے بن میں جس ایثار کا مظاہرہ کیا۔ اس کی مثال تاریخ عالم میں ملنا محال ہے۔

حسینؑ کے دل میں انسانیت کا بڑا درد تھا۔ چنانچہ جب شمر نے آپ کا سر کاٹنا چاہا تو اس نے دیکھا کہ حسینؑ کے لب ہل رہے ہیں۔ اسے یقین تھا کہ آپ ضرور اپنے دشمنوں کے لیے بددعا کر رہے ہوں گے۔ لیکن جب اس نے اپنا کان آپ کے تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں سے ملایا۔ تو اس نے سنا کہ حسینؑ اپنے پیدا کرنے والے سے یہ عرض کر رہے ہیں۔ "خداوندا! میں نے اپنا وعدہ وفا کیا، اب تو بھی اپنا وعدہ پورا کر اور میرے نانا کی غلط کار امّت کو بخش دے۔"

حسینؑ کا یہ جملہ شاہد ہے کہ وہ جاہل اور پسماندہ انسانیت کا درد رکھتے تھے کہ اس کی نجات کے لیے اپنی اور اپنے گھر کی موت بھی ان کو قبول تھی۔ وہ انسانوں کی فلاح و نجات کے خواہش مند تھے اور اس راہ میں ان کو فنا کا بھی سامنا ہو تو اسے خندہ پیشانی سے قبول کرنے پر آمادہ تھے!

حسینؑ بے پناہ عزم و ثبات کے مالک تھے ان پر ہزاروں مصائب ٹوٹے۔ ان کو طرح طرح کے طوفانوں سے گزرنا پڑا ان کی راہ میں آگ کے دریا حائل ہوئے۔ موت نے قدم قدم پر ان کا دامن تھاما۔ لیکن ان کے قدموں میں

کبھی کوئی لغزش پیدا نہیں ہوئی۔ وہ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ جمے رہے۔ ان کے ابروؤں پر کبھی میل نہیں آیا۔ وہ ثبات و استقلال کا ایک ایسا مستحکم مینارہ ثابت ہوئے جسے باد مخالف کا سخت سے سخت جھونکا بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتا!

حسینؑ للّٰہیت و خلوص کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ انھوں نے بڑی بے لوثی سے قوم کی خدمت کی، بلا کسی فائدہ کے حق پر مر مٹنا گوارا فرمایا اور بغیر کسی لالچ یا منفعت ذاتی کے ہر قسم کی مصیبتیں جھیل کے اپنے نانا کے پیغام کو ایک نئی زندگی عطا کر گئے!

حسینؑ بے حد شریف تھے اور ایک شریف انسان کی حیثیت سے آن پر جان دے دینا قابل فخر سمجھتے تھے۔ انھوں نے بے عزّتی کی زندگی پر عزّت کی موت کو ترجیح دے کر نہ صرف اپنی بلکہ اسلام کی آن رکھ لی۔ انھوں نے ایک شراب خوار، زانی، کمینہ فطرت اور رنگیلے سلطان کے سامنے سر جھکانے کے بجائے اپنا سر کٹانا گوارا کیا۔ اور یہ ان کی شرافت نفس کا ایک ایسا ثبوت ہے جس پر خود شرافت ہمیشہ ناز کر سکتی ہے۔

حسینؑ اخلاقِ حسنہ کا نمونہ تھے۔ انھوں نے کربلا میں جس اخلاق و کردار کا مظاہرہ کیا ہے، اس کی نظیر تاریخ عالم میں ملنا محال ہے، دوستوں سے محبت، مذہب سے محبت، انسانیت سے محبت اور اللہ سے محبت کی جیسی عظیم اور پُر اثر مثال حسینؑ نے پیش کی ہے۔ اس پر انسانیت ہمیشہ فخر کا تاج کج کرتی رہے گی!

حسینؑ ایک بڑے انسان تھے جن کو جینا بھی آتا تھا اور مرنا بھی آتا تھا۔ وہ ایک اصول کے لیے جیئے اور ایک اصول کے لیے مرے۔ وہ اس طرح جیئے کہ آج تک دنیا میں ان کا نام زندہ ہے۔ اور اس شان سے مرے کہ قیامت تک ہر حق پرست کے دل میں ان کا مزار موجود رہے گا۔ وہ زندہ رہے تاکہ اللہ کا نام زندہ رہے اور مر گئے

تاکہ حق کو حیات دوام مل جائے ۔ ان کی زندگی بھی ایک نمونہ تھی اور ان کی موت بھی ایک حیات آفریں مثال !

حسینؑ ایک بڑے انقلابی تھے ۔ ایسے انقلابی جس نے اموی سلطنت کے جاہ وحشم کو خاک میں ملا دیا ۔ جس نے اپنے پاک لہو کی دھاروں سے تاریخ کا دھارا موڑ دیا ۔ جس نے اپنے حق پرستانہ مجاہدہ سے ظلم و جبر کی بنیادیں ہلا دیں ۔ جس نے شیرانہ تیوروں سے طوفانوں کے رُخ موڑ دیے ۔ جس نے مظلومیت کے حربوں سے ظلم کی طاقتوں کے پرخچے اڑا دیے ۔ جس نے اپنی عظیم تعلیمات سے انسانی فکر و نظر کے انداز بدل دیے ۔ اور جس نے خون کی پُر ہول موجوں کو کاٹ کے ایمان کا سفینہ ساحلِ مراد سے ہمکنار کر دیا ۔

حسینؑ بڑے حریت پسند تھے ۔ انھوں نے اپنی اور اپنے پورے گھرانے کی موت قبول کی لیکن یزید کی بیعت (غلامی) پر تیار نہیں ہوئے ۔ انھوں نے شہنشاہیت کے فرمانِ غلامی کو حقارت سے ٹھکرا دیا اور اپنی شخصی اور مذہبی آزادی کی خون کے آخری قطرے تک مدافعت کرتے ہوئے شہید ہو گئے ۔ انھوں نے انسانی آزادی کے اعلیٰ نصب العین کو برقرار رکھنے کے لیے جان دی اور اس لحاظ سے وہ نہ صرف مسلمانوں کے بلکہ ساری دنیا کے حریت پسند انسانوں کے قائد تسلیم کیے جانے کے قابل ہیں !

مجھے حسینؑ سے محبت ہے ۔ اس لیے کہ حسینؑ حق پرست تھے ۔ دیندار تھے ۔ اللہ والے تھے ۔ عبادت گذار تھے ۔ دلیر تھے ۔ سخی تھے ۔ اصول پسند تھے ۔ حق گو تھے ۔ مجسمہ اخلاق تھے ۔ اور سب سے بڑھ کے حسینؑ ایک کامل انسان تھے !" ——————

——— انسانیت کا اعلیٰ ترین نمونہ ! نطشے کے خیالی فوق البشر سے زیادہ

حسین حقیقت! ہمارے تصوّرات سے بھی زیادہ بلند اور کامل شخصیت!
ایسی حالت میں مجھے یقین ہے کہ نہ صرف میں بلکہ سچائی، حقانیت اور انسانیت سے محبت رکھنے والا ہر انسان حسینؑ سے محبت کرنے پر مجبور ہے!

حسینؑ انسانیت کے ہیرو ہیں، انسانیت کے محبوب ہیں۔ اور جب تک دنیا میں انسان اور انسانیت کا وجود ہے۔ تب تک ان سے محبت کی جاتی رہنا بھی یقینی ہے!

◎

MOASSESAH AL IMAM KHOMEINI TRUST (REGD)
کتابخانہ امام خمینی
MOASSESAH AL IMAM KHOMEINI TRUST (REGD)
کتابخانہ امام خمینی

پہلا تعارف

تقریباً تیس سال ادھر کی بات ہے ——————

—— جاڑوں کا زمانہ تھا اور رات کا وقت، کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ ساری فضا یخ بستہ سی ہو رہی تھی، رات بھیگ چکی تھی۔ تقریباً دو کا عمل تھا کہ اچانک میری آنکھ کھلی اور میں نے سُنا، دور کہیں سے "حسینؑ، حسینؑ" کی آواز آ رہی تھی، اس آواز میں درد بھی تھا، اور کشش بھی، غم کی کسک بھی تھی اور محبت کی شیرینی بھی۔ میرے کان اس آواز پر لگ گئے، اور جیسے دل بھی کچھ اس کی جانب کھنچنے لگا!

"حسینؑ، حسینؑ، حسینؑ، حسینؑ ——— مجھے ایسا معلوم ہوا، جیسے ساری فضا "حسینؑ، حسینؑ" کہہ رہی ہے۔ جیسے زمین کا ذرّہ، ذرّہ "حسینؑ حسینؑ" پکار رہا ہے۔ جیسے پوری کائنات "حسینؑ، حسینؑ" کے پُر تاثیر نغمہ میں ڈوب گئی ہے!

میں کمبل اوڑھے کمرے سے باہر نکلا، لیلیٰ شب کی کالی اور خنک زلفیں سارے عالم پر چھائی تھیں۔ اَوس سے دیواریں نم تھیں، صحن بھیگ چکا تھا، ستارے جھلمل، جھلمل کر رہے تھے فضا پر کہر کی ہلکی ہلکی چادریں بکھر جانے سے ایک اداسی سی طاری تھی، دور، آکاش کے ایک کونے میں، بوڑھا چاند اپنی دھندلی کرنیں سمیٹے، جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوبا دکھائی دے رہا تھا۔ چاروں طرف ایک سنّاٹا چھایا ہوا تھا، ایک بھیانک اور نہ ٹوٹنے والا

سنّاٹا۔ میں نے محسوس کیا، جیسے پورا ماحول غمناک ہو رہا ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ ہر چیز رو رہی ہے۔ آسمان رو رہا ہے، زمین رو رہی ہے، فضا رو رہی ہے، ہوائیں رو رہی ہیں۔ چاند اور تارے رو رہے ہیں۔ یہ کالی اور خنک رات رو رہی ہے، جیسے کائنات کی ہر شے رو رہی ہے۔ اور اس احساس کے ساتھ جیسے مجھ پر اداسی چھا گئی۔ اور پھر وہی "حسینؑ، حسینؑ، حسینؑ، حسینؑ، حسینؑ" اس آواز کے ساتھ کہر کے بادل کچھ اور گہرے ہو گئے۔ چاند کی کرنیں کچھ اور دھندلی پڑ گئیں۔ ستاروں کی روشنی اور کم ہو گئی ——— جیسے کائنات کے غم میں کچھ اور اضافہ ہو گیا! "حسینؑ، حسینؑ، حسینؑ، حسینؑ"

مجھے اچانک یاد آیا کہ آج عاشور کی رات ہے۔ یہ رات پہلے بھی ——— میری زندگی میں کئی بار آئی تھی اور میں نے اس کی صبح کو بار بار یہ منظر دیکھا تھا کہ ہزاروں آدمی، سر و پا برہنہ، عَلم اور تعزیے لیے، سینہ زنی کرتے، آنکھوں سے آنسوؤں کی گنگا جمنا بہاتے "حسینؑ، حسینؑ" کرتے شہر سے دور ایک غیر آباد علاقہ میں بنی ہوئی کربلا کو جا رہے ہیں۔ راستہ میں جگہ جگہ سبیلیں قائم ہیں جہاں "نیاز حسینؑ" کا شربت تقسیم ہو رہا ہے۔ بچے تو شربت پی لیتے ہیں لیکن بڑے بھوکے، پیاسے صرف نوحہ و ماتم میں مصروف ہیں۔ اُن کے چہروں پر غم کی بدلیاں چھائی ہوئی ہیں منہ اترے ہوئے ہیں۔ ہونٹ خشک ہیں، لیکن ایک والہانہ جوش ہے جو ان سب پر طاری ہے، کہیں سینہ زنی ہو رہی ہے تو کہیں زنجیروں کی چھن چھن کے ساتھ خون کی چھینٹیں اڑ رہی ہیں۔ ادھر کربلا نزدیک آئی، ادھر شور گریہ و ماتم میں اضافہ ہوا۔ اب وہ قیامت کا ماتم ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ جسے دیکھیے وہ ایک عجیب محویت کے انداز میں سینہ زنی کر رہا ہے۔ سینے پھٹ چکے ہیں۔ لیکن ہاتھ نہیں رُکتے۔ ماتم کا جوش بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ماتم کرنے والے ماتم کر رہے ہیں۔ سننے والے دھاڑیں مار مار کے رو رہے ہیں اور میں سوچتا تھا کہ خدایا! یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کس مظلوم کا سوگ ہے جو اس شان سے منایا جا رہا

ہے۔ یہ حسرت بھری آنکھیں کیوں نمناک ہیں۔ یہ بھاری بھاری ہاتھ کیوں سینہ کوبی کرنے پر مائل ہیں؟ یہ دل کیوں چاک چاک ہیں؟ یہ سینے کس لیے داغدار ہیں؟ آخر یہ غم والم کیوں؟ یہ طغیان اشک وآہ کس لیے؟ ——— لیکن میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا! ———

——— اور آج رات کو مجھے پھر اسی غم سے واسطہ تھا۔ پھر وہی "حسینؑ، حسینؑ" کی دلدوز چیخیں تھیں۔ جو میرے کلیجہ کو برما رہی تھیں پھر وہی غم میں ڈوبی ہوئی صدائیں تھیں۔ جو میرے کان کے پردوں سے ٹکراتی، دل میں اترتی جارہی تھیں۔ پھر وہی ماتم وشیون کا شور تھا جو میرے دل دماغ پر مستولی ہو رہا تھا ——— ! لیکن آج، آج مجھے اس غم میں کچھ لذت سی محسوس ہو رہی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں بھی غم مناؤں، روؤں، آنکھوں سے خون کے آنسو بہاؤں۔ اور "حسینؑ، حسینؑ" کے نعروں سے فضا میں ارتعاش پیدا کردوں ——— نہ معلوم کیوں؟ ——— نہ جانے کس لیے میرا دل حسینؑ کی جانب کھچ رہا تھا۔ آہ وبکا پر مائل ہو رہا تھا۔ اور میں ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے حسینؑ خود میرے اپنے عزیز ہیں۔ مجھے ان پر رونا چاہیے۔ اور اتنا ماتم کرنا چاہیے کہ ساری دنیا کا کلیجہ ہل جائے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ تڑپ اٹھے۔ اور زمین کے سینہ سے درد کے ایسے سوتے ابل پڑیں۔ جن کی طغیانی میں ہر متنفس ڈوب جائے ———

میں نے محسوس کیا کہ حسینؑ کی محبت میری نس نس میں پیرتی جارہی ہے۔ محبت کا ایک امنڈتا ہوا جذبہ ہے جو مجھ پر طاری ہوتا جارہا ہے۔ ایک بجلی ہے جو دل سے نکل رہی ہے اور سارے جسم میں دوڑتی جارہی ہے میں کچھ کھویا سا جارہا ہوں۔ محویت کے ایک اتھاہ سمندر میں ڈوبا جارہا ہوں۔ اور پھر اچانک میرا ہاتھ اٹھ کر سینہ تک چلا گیا۔ آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ اور زبان سے بے ساختہ نکل گیا "حسینؑ، حسینؑ"۔

یہ حسینؑ مظلوم سے میرا پہلا "تعارف" تھا!

رات ڈھلی اور دن نمودار ہوا۔ صبح ہی سے ماتمیوں کے گروہ سینہ زنی کرتے کربلا روانہ ہونے لگے۔ سر و پا برہنہ، گریبان چاک کالے کپڑے پہنے سروں پر خاک ڈالے، آنسو بہاتے، روتے پیٹتے اور حسینؑ حسینؑ کی جگر خراش آوازوں سے سننے والوں کے دلوں میں سوئیاں چبھوتے ——— میں نے بھی فیصلہ کیا کہ میں بھی کربلا جاؤں گا اور آج حسینؑ پیارے کی ساری داستان الم سن کے ہی واپس ہوں گا۔

میں کربلا گیا۔ ایک طرف میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ زمین پر بیٹھے گریہ میں مصروف ہیں۔ اور ایک صاحب کرسی پر بیٹھے تقریر کر رہے ہیں۔ میں بھی زمین پر بیٹھ کے تقریر سننے لگا۔ مجھے پورے الفاظ تو یاد نہیں البتہ وہ کچھ اس قسم کی تقریر تھی:

"جب مولا کے تمام اعزہ و انصار شہید ہو چکے، تو آپ نے اپنے چاروں طرف ایک حسرت بھری نظر ڈالی، درد و الم میں ڈوبی ہوئی نگاہ سے آپ نے دیکھا کہ ایک طرف بنی ہاشم کے شیر سر کٹائے، خون میں نہائے موت کی آغوش میں آرام کر رہے ہیں تو دوسری طرف جاں نثار انصار موت سے پیمان وفا باندھے ابدی نیند سو رہے ہیں۔ یہ سماں دیکھ کر آپ کا سینہ پھٹنے لگا۔ اپنی تنہائی اور بے بسی پر کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ اور بے اختیار پکار اُٹھے "ہے کوئی میری مدد کرنے والا جو اس پُرآشوب وقت میں مدد کرے؟" ہے کوئی سہارا دینے والا جو مجھ مظلوم اور ستم رسیدہ کو سہارا دے؟ ہے کوئی ناصر جو اس تلخ موقعہ پر میری نصرت کرے؟" ادھر مولا کی یہ صدائے استغاثہ بلند ہوئی اُدھر خیمہ سے بیبیوں کے ماتم کی آواز آئی، غیرت دار امام سے یہ برداشت نہ ہو سکا کہ ان کی زندگی میں بیبیوں کی صدا خیمہ سے باہر آجائے اور جلدی سے پلٹے اور خیمہ میں آئے، دکھیا بہن نے عرض کی "بھیا آپ کے

استغاثہ کی آواز سُن کر علی اصغرؑ نے اپنے کو جھولے سے گرا دیا ہے! آپ نے یہ جملہ سنا اور ایک لمحہ کے لیے سوچ میں ڈوب گئے شاید یہ خیال آیا ہے کہ ——— "حسینؑ! ابھی تیرے خزانے میں یہ ننھا سا موتی باقی ہے۔ اسے بھی اللہ کی راہ میں دے ڈال! حسینؑ! امت جد کی رستگاری کے لیے یہ فدیہ بھی پیش کرنا ضروری ہے! حسینؑ! قوم کو اپنی رستگاری کے لیے علی اصغر کا خون ناحق بھی درکار ہے، آگے بڑھو حسینؑ! اٹھاؤ اپنے لال کو اور لے چلو اس کو قربانگاہ میں! نانا کی امت کو نجات دلانا چاہتے ہو تو یہ قربانی بھی پیش کرنا ہی ہوگی"

اور شاید اس خیال کے آتے ہی آپ نے فرمایا! "ذرا بچہ کو میرے پاس لے آؤ۔" زینب علی اصغر کو لائیں، آپ نے ایک ہاتھ میں شش ماہہ بچہ کو سنبھالا دوسرے سے عبا کا دامن ننھی سی جان پر ڈالا۔ ماں کو تسکین دی اور باہر تشریف لائے۔ دشمن نے دیکھا کہ حسینؑ دامن میں کچھ چھپائے اس کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ لوگوں کو خیال ہوا کہ شاید قرآن لا رہے ہوں گے۔ اور اس کا واسطہ دے کر امان طلب کریں گے؟ لیکن ان کا خیال غلط نکلا، حسینؑ ایک بلندی پر چڑھ گئے۔ عبا کا دامن ہٹایا بچے کو دونوں ہاتھوں پر بلند کیا اور پکار کے کہا کہ اے قوم! اگر تمہارے خیال میں حسینؑ گناہگار ہے تو اس بچہ نے تو کچھ قصور نہیں کیا ہے۔ اس کی ماں کا دودھ خوف سے خشک ہو گیا ہے۔ اور یہ پیاس سے تڑپ رہا ہے۔ اسے ذرا سا پانی پلا دو!" یہ کہا اور چند لمحہ کے لیے خاموش ہو گئے۔ پھر فرمایا "اگر تمہیں خیال ہو کہ حسینؑ اس بچہ کے بہانے سے پانی پی لے گا۔ تو لو میں اسے جلتی ہوئی ریتی پر لٹا دیتا ہوں۔ تم خود آؤ اور اسے پانی پلا کر موت کے چنگل سے بچا لو۔" لشکر والوں نے حسینؑ کی بات

سُنی اور کوئی جواب نہیں دیا۔ آخر مجبوراً آپ علی اصغرؑ کی جانب متوجہ ہوئے۔ فرمایا "بیٹا تم حجت خدا کے فرزند ہو، اتمام حجت کا وقت ہے۔ تم بھی اپنی پیاس ظاہر کرو تاکہ ان ظالموں کو میرے الفاظ کی صداقت کا یقین ہو جائے!" امام کا حکم سنتے ہی علی اصغرؑ نے غش سے آنکھیں کھول دیں اور اپنی سوکھی ہوئی زبان پپڑائے ہوئے ہونٹوں پر پھرانے لگے افسوس کہ لعینوں کو اس معصوم کی بے زبانی پر بھی ترس نہ آیا۔ عمر سعد نے حرملہ کو حکم دیا کہ "اپنی تیر اندازی کے جوہر دکھا" اس سنگدل نے حکم سنتے ہی دوش سے کمان اتاری، ترکش سے تین بھال کا زہریلا تیر نکالا، اور وہ ستم کیا کہ انسانیت کی روح تڑپ اُٹھی۔ کائنات میں، ہلچل مچ گئی۔ علی اصغرؑ کا گلا اور حسینؑ کا بازو ایک ساتھ چھد گئے۔ بچہ باپ کے ہاتھوں پر ذبح ہو گیا۔ حسینؑ کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔ لیکن اللہ رے صابر امام، کہ زبان سے اُف تک نہ نکلی، کلیجہ پر پتھر کی سل رکھتے ہوئے معصوم کے گلے سے تیر کھینچا، تیر کے ساتھ حلقوم سے خون جاری ہوا۔ حسینؑ نے یہ خون چلو میں لے لیا۔ چاہا کہ اسے آسمان کی جانب اچھال دیں لیکن غیب سے آواز آئی "حسینؑ اگر یہ خون فضا میں اچھال دیا تو قیامت تک آسمان سے ایک قطرہ پانی نہیں برسے گا۔ اور تمہارے نانا کی امت پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جائے گی۔" حسینؑ نے یہ بات سُنی اور دل تلملا اُٹھا "نانا کی امت اور بارانِ رحمت سے محروم رہے؟ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا! پھر چاہا یہ خون زمین پر پھینک دیں اِدھر یہ خیال مولا کے دل میں پیدا ہوا، اُدھر زمین میں یہ تزلزل پیدا ہوا۔ آواز آئی "حسینؑ! اگر یہ خونِ ناحق زمین پر گرا تو قیامت تک زمین سے ایک دانہ اناج پیدا نہیں ہوگا۔ اور تمہارے جد کی امت بھوکوں مر جائے گی!" مولا نانے یہ آواز بھی

سنی اور کانپ اُٹھے نانا کی امت اور بھوکوں مرجائے! نانا کی امت اور تکلیف سہے! نہیں ایسا نہیں ہو سکتا! لیکن پھر اس خون کا کیا کیا جائے؟

؎ انکار آسماں کو ہے راضی زمیں نہیں
اصغرؑ تمہارے خون کا ٹھکانا کہیں نہیں

نہیں، اس خون کا ٹھکانا موجود تھا، مولا نے ہاتھ اٹھایا اور خون اپنے چہرے پر مل لیا، فرمایا "بار الٰہا! تو گواہ رہنا یہ معصوم کا خون ہے جسے میں نے اپنے چہرے پر ملا ہے! میں چاہتا ہوں کہ اسی طرح سرخرو تیرے دربار میں حاضر ہوں اور پھر اس خونِ ناحق کے بدلہ میں تجھ سے نانا کی امت کی شفاعت کا طلب گار ہوں!

خداوندا! یہ خون ناقہ صالح کے خون سے افضل ہے۔ یہ تیرے رسولؐ کی آل کا خون ہے۔ ایک چھ ماہ کے معصوم نبی زادہ کا خون ہے۔ میں خوش ہوں کہ تو نے میری قربانی قبول کی، اب میں اس قربانی کے طفیل میں، اسی خونِ ناحق کے تصدق میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ میرے نانا کی امت کو بخش دے!"

علی اصغرؑ کی لاش حسینؑ کے ہاتھوں پر تھی، چاہا کہ اسے خیمہ میں لے جائیں۔ چند قدم بڑھے لیکن پھر پیچھے پلٹ آئے بار بار بڑھتے تھے اور پھر جیسے قدم رک جاتے تھے۔ سوچتے ہوں گے کہ سیدانیوں کو کیا جواب دوں گا؟ جب رُبابؑ دامن پکڑے گی تو اسے کیسے سمجھاؤں گا؟ بالی سکینہؑ اپنے ننھے سے بھائی کا حلقوم بریدہ دیکھے گی تو اس کے ننھے سے دل پہ کیا بیتے گی؟ آخر یہی سوچتے سوچتے آپ نے کمر سے تلوار نکالی، زمین کھودی، اور اپنے اس معصوم تحفہ کو قبر کے سپرد کر کے اٹھ کھڑے ہوئے زبان پر حرف

ایک جملہ تھا اور وہ تھا انا للہ و انا الیہ راجعون رضاً بقضاۂ وتسلیماً لامرہٖ "ہم اللہ کے لیے ہی ہیں اور اسی کی طرف پلٹ کر جانے والے ہیں۔ میں اپنے رب کی مشیت پر راضی ہوں اور اس کے ہر حکم کے سامنے سر جھکاتا ہوں۔"

مجلس ختم ہو گئی، لوگ اٹھ گئے، میں بھی اٹھا، لیکن دل پر ایک بوجھ سا لیے، ایک غبار تھا جو میرے قلب پر طاری تھا ایک دھند سا تھا جو میرے افکار پر چھا رہا تھا۔ طبیعت اچاٹ اور غمناک ہو چکی تھی۔ چنانچہ تھوڑی دیر تک ماتم سننے کے بعد میں گھر واپس ہو گیا۔

مجسّمۂ حق

بڑا دلدوز واقعہ تھا یہ! ـــــ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور میں نے سوچا "پروردگار! تیری زمین پر ایسے آدمی بھی گذرے ہیں جو اتنی بڑی قربانی دے سکتے ہیں! جو تیری خوشی کے لیے اپنے ہاتھوں پر اپنے بچہ کی موت گوارا کر سکتے ہیں! جو دوسروں کی نجات کے لیے اپنی معصوم اولاد کو بھی تیروں کے سپرد کر سکتے ہیں! جو اس بے پناہ صبر و استقلال کے ساتھ مسکراتے ہوئے موت سے کھیل سکتے ہیں! اور جن کے نزدیک دنیا کی عزیز سے عزیز شے بھی تیرے مقابلے میں عزیز نہیں ہوا کرتی! جو صرف تیری رضا کے لیے جیتے ہیں اور تیری رضا کے لیے مرتے ہیں، جو تیری بارگاہ میں اپنا سب کچھ پیش کر دینے کی طاقت رکھتے ہیں اور جن کے دلوں میں ایمان اتنا راسخ ہے کہ وہ اس کی خاطر چھ ماہ کے بچہ کا مظلومانہ ذبیحہ بھی برداشت کر سکتے ہیں!"

اور پھر میرا دماغ کچھ اور سوچنے پر مجبور ہوا، میں نے سوچا کہ حسینؑ ضرور حق پر تھے۔ حسینؑ کو اپنے حق پر ہونے کا حق الیقین تھا۔ پختہ اور کامل اعتقاد، کیونکہ جب تک انسان کو اپنی حقانیت کا ایسا ہی گہرا اور پختہ یقین نہ ہو۔ تب تک وہ محض چند مجرد اصولوں کی خاطر اپنے چھ ماہ کے بچہ کی قربانی پیش کرنے پر تیار نہیں ہو سکتا۔ یہ درجہ انسان کو تبھی حاصل ہوتا ہے جب اسے اپنے اصولوں کی صحت پر حق الیقین

ہوا کرتا ہے۔ آنکھوں دیکھا یقین۔ جب وہ ان اصولوں پر اتنا ہی مضبوط اعتقاد رکھتا ہے جتنا کہ اپنے وجود پر رکھ سکتا ہے۔ جب اس کے لیے شک اور ریب کے تمام پردے اُٹھ چکے ہوتے ہیں اور جب وہ حقیقت کو برافگندہ نقاب، خود اپنی نگاہوں سے دیکھ لیتا ہے ——— اگر حسینؑ نے حقیقت کا مشاہدہ نہ کیا ہوتا۔ اگر حسینؑ کا ایمان صرف سنی سنائی باتوں پر ہوتا اور انھوں نے اپنی آنکھوں سے صداقت کا نور نہ دیکھا ہوتا۔ اگر حسینؑ کے دل کے کسی بھی گوشے میں شک کی کیفیات موجود ہوتیں، اگر حسینؑ کو خدا کے وجود میں ایک ذرا بھی شبہ ہوتا۔ اگر حسینؑ کو اپنے نانا کے پیغام کی صحت و اصابت کا کامل یقین نہ ہوتا ——— اور مجھے کہنے دیجیے کہ اگر حق کا ادراک کرتے کرتے حسینؑ خود حق کے سانچے میں نہ ڈھل گئے ہوتے۔ اگر حسینؑ خود حق نہ بن گئے ہوتے تو ہرگز وہ اتنی بڑی قربانی نہیں دے سکتے تھے۔ علی اصغرؑ کی قربانی، حسینؑ اور ان کے پیغام کی صداقت و حقانیت کا سب سے بڑا، سب سے روشن اور سب سے زیادہ اثر آفرین ثبوت ہے۔ ایسا ثبوت جس کے بعد کسی دوسرے ثبوت کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی!

علی اصغرؑ کی معصوم شہادت جس طرح حسینؑ کی حقانیت کی دلیل روشن ہے اسی طرح ان کے مخالفین کی غلط کاری اور غلط روی کا بھی سب سے بڑا ثبوت ہے۔ چھ ماہ کے بچہ کو ذبح کر دینا انسانیت دشمنی کا سب سے بڑا، سب سے گندہ اور سب سے گھناؤنا مظاہرہ ہے۔ اگر حسینؑ کے مخالفین میں حقانیت کا چھوٹے سے چھوٹا ذرہ بھی موجود ہوتا۔ تو وہ ہرگز یہ بھیانک ظلم نہ کرتے کہ باپ کے ہاتھوں میں اس شیشا ہے بچہ کو ذبح کر ڈالتے، ان کی یہ ظالمانہ حرکت بجائے خود ان کی شقاوت، ان کی سنگدلی، ان کے قلوب کی تاریکی اور ان کے ضمیر کی موت کا ثبوت ہے

اور مجھے یقین ہے کہ جن لوگوں کے دل اتنے تاریک ہوں، جن کے ضمیر اس حد تک مُردہ ہو چکے ہوں، جن میں انسانیت اور اس کی قدروں کا کوئی احساس باقی نہ ہو۔ اور جن کے سینوں میں دلوں کے بجائے پتھر ہوں ان میں نیکی یا اس کی کوئی خو بو نہیں پائی جا سکتی وہ درندہ اور وحشی تھے۔ اور وحشیوں سے حقانیت کی کوئی امید کرنا قطعاً خلافِ عقل ہے۔

علی اصغرؑ کی شہادت اس امر کا بھی ثبوت ہے کہ حسینؑ ایک اصول کی خاطر جنگ کر رہے تھے، اور ان کی ذاتی منفعت سے کوئی تعلق نہیں تھا اگر حسینؑ اپنی بادشاہت کے قیام کے لیے لڑتے ہوتے تو وہ اپنے چھ ماہ کے بچہ کو ہرگز میدان میں نہ لاتے اور اپنی اولادوں کو نہ کٹواتے۔ بادشاہت کے لیے لڑنے والے اپنی اور اپنی اولادوں کی جان کو تہلکہ میں نہیں ڈالتے، اچھے سورماؤں کا لشکر تیار کرتے ہیں اور اسے میدان میں لاتے ہیں، چھ ماہ کے بچہ کو تیروں کے سامنے پیش نہیں کرتے اس کا لہو اپنے چہرہ پر نہیں ملتے اور اپنے بچہ کی موت پر اس خاموشی سے صبر نہیں کر لیتے جس کا مظاہرہ حسینؑ نے کیا۔ ششماہہ بچہ کو میدان میں وہی لاتا ہے جو اپنے اصولوں کی صحت و اصابت ثابت کرنا چاہتا ہے، جو کسی اصول کی خاطر قربانیاں دینے کا عزم رکھتا ہے۔ اور جس کی جدوجہد میں کوئی ذاتی غرض و غایت پوشیدہ نہیں ہوتی۔ علی اصغرؑ کو میدان میں لانا حسینؑ کی للّٰہیت کا کھلا ہوا ثبوت ہے، ان کی بے لوثی اور بے غرضی کا مکمل مظاہرہ ہے۔ اور اس سے وہ جذبۂ فدائیت بھی پورے طور پر آشکار ہو جاتا ہے جو حسینؑ کے دل میں موجزن تھا۔ امام حسینؑ نے اپنے چھ ماہ کے بچہ کو حرملہ کے تیر سے ذبح کرا کے یہ ثابت کر دیا کہ وہ کربلا کے بن میں حصول حکومت کے لیے نہیں آئے تھے، ایک اصول کے لیے لڑنے آئے تھے، اور وہ اس اصول کی صداقت پر اس حد تک ایمان

رکھتے تھے کہ وہ اس کی خاطر اپنی کمسن اولادوں تک کو قربان کرنے پہ تیار تھے۔

علی اصغرؑ کی شہادت حسینؑ کے مخالفین کی بے اصولی کی کھلی ہوئی مظہر ہے، اگر یہ لوگ حسینؑ سے کوئی اصولی جنگ کر رہے تھے۔ تو یہ جنگ حسینؑ اور ان کے ساتھیوں تک محدود رہتی۔ چھ ماہ کے بچہ کو ذبح کرنے کی حد تک آگے نہ بڑھتی، ظاہر ہے کہ بیعت کا سوال حسینؑ سے ہو سکتا تھا چھ ماہ کے بچہ سے نہیں ہو سکتا تھا۔ اس بچہ کا ذبح کر ڈالا جانا اس کا ثبوت ہے کہ یزید اور اس کے ہمنوا آل رسولؐ کو ختم کر دینا چاہتے تھے۔ ان کا مقصد بیعت لینا نہیں تھا۔ بلکہ حسینؑ اور ان کے خاندان کو ختم کر ڈالنا تھا ——— اور ظاہر ہے کہ پیغمبرؐ اسلام کی نسل کو قطع کر دینا کوئی ایسا مقصد نہیں ہو سکتا جسے کسی اصولی جنگ سے تعبیر کیا جا سکے!

علی اصغرؑ کی شہادت حسینؑ کی مظلومیت اور ان کے مخالفین کے ظلم و ستم کا مظہر اتم ہے۔ اس سے زیادہ مظلومیت اور کیا ہو سکتی ہے؟ کہ چھ ماہ کا بھوکا پیاسا بچہ باپ کے ہاتھوں پہ ذبح ہو جائے۔ اور مظلوم باپ آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ ٹپکا سکے؟ اس سے زیادہ ظلم اور کیا ہو سکتا ہے کہ باپ پیاس سے دم توڑتے ہوئے بچہ کے لیے پانی مانگے اور اس سوالِ آب کا جواب تین بھال کے تیر سے دیا جائے؟ مظلومیت اور ظلم یہ ایسی ناقابل انکار مثالیں ہیں جن کے بعد یزیدیت کے لیے سر چھپانے کا کوئی موقع نہیں رہ جاتا!

میں نے علی اصغرؑ کی شہادت کی داستان سنی اور اس سے بہت متاثر ہوا، اس ایک واقعہ نے مجھے یقین دلا دیا کہ حسینؑ حقانیت کے لیے لڑے تھے، حسینؑ کو اپنے پیدا کرنے والے پر اتنا اعتقاد تھا کہ وہ اس کے نام کی عظمت کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینے پر تیار تھے، حسینؑ

کو اپنے نانا کی صداقت پر ایسا پختہ یقین تھا کہ وہ ان کے پیغام کی بقا کی خاطر اپنی جان تک قربان کر سکتے تھے۔ حسینؑ میں وہ فدائیت اور للّٰہیت موجود تھی جو صرف اولیاء اللہ میں ہوا کرتی ہے اور حسینؑ اللہ کے ان نیک بندوں میں سے ایک تھے جو نسل انسانی کی ہدایت کے لیے مامور ہوا کرتے ہیں!

مجھے یقین ہے کہ اگر حسینؑ اور کچھ نہ کرتے بلکہ صرف علی اصغرؑ کی قربانی دے دیتے تو صرف یہی ایک واقعہ ان کی حقانیت اور صداقت کا سب سے بڑا ثبوت ہوتا۔ صرف اسی ایک واقعہ سے معلوم ہو جاتا کہ وہ اللہ کے ان پیارے بندوں میں شامل تھے جن کا مشن ہوتا ہے انسانیت کی اصلاح کرنا، انسانوں کو صحیح اور سچا راستہ دکھانا، انسانوں کی زندگی کو اعلیٰ منازل سے ہمکنار کرنا اور انسان کو اس پستی سے نکالنا جس میں حرص پرستی اور دنیا داری اسے مبتلا کر دیا کرتی ہے!

یہ سچ ہے کہ حسینؑ مسلمان تھے۔ مسلمانوں کے پیغمبرؐ کے نواسے تھے، لیکن میرا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ ایسے انسان کسی ایک مذہب یا کسی ایک قوم کے ساتھ مخصوص نہیں ہوا کرتے

وہ انسانیت کے ہیرو ہوتے ہیں۔ بنی نوع انسان کی مشترکہ ملکیت ہوتے ہیں، اور ان تمام انسانوں سے بلا افتراق مذہب و ملت ان کا تعلق ہوتا ہے جو حق اور سچائی کے پرستار ہوتے ہیں۔ حسینؑ کا کارنامہ ساری دنیائے انسانیت کے لیے موجب فخر ہے، اس سے دنیا کے ہر انسان کا سر اونچا ہوتا ہے۔ اس سے دنیا کے ہر ملک اور مذہب سے تعلق رکھنے والے نیک اور حق پرست انسانوں کی ہمت افزائی ہوتی ہے۔ اس سے ہم سب کو مذہب کی سچائیوں پر مر مٹنے کا درس ملتا ہے۔ خدا اور اس کے بندوں کی خاطر

قربانیاں پیش کرنے کا سبق حاصل ہوتا ہے، انسانیت کی ترقی کے
لیے ہر طرح کا ایثار کرنے کا ذوق ابھرتا ہے اور آج کے دورِ لامذہبیت
میں مذہب کی صداقت اور افادیت کا ایک ایسا روشن ثبوت حاصل
ہوتا ہے جس کے مقابلہ میں مادہ پرستوں کی ساری فلسفہ طرازی اور مخالفینِ
مذہب کی تمام موشگافیاں ہیچ اور ناکارہ محض معلوم ہونے لگتی ہیں ؎

حقیقی فاتح

ہر دور اور ہر زمانہ میں حق اور باطل کے مابین معرکہ آرائی ہوتی رہی ہے۔ نیکی اور بدی کی طاقتیں ایک دوسرے سے ٹکراتی رہی ہیں، اچھائی اور برائی، نور اور نار میں مقابلہ جاری ہے ——

حق اور باطل کی یہ کش مکش کسی ایک خاص دور، کسی ایک خاص ملک یا کسی ایک خاص قوم سے مخصوص نہیں رہی ہے۔ دنیا کے ہر ملک میں اور ہر قوم میں اس کے نمونے موجود ہیں، کوروؤں کے مقابلہ میں پانڈوؤں کی جنگ، راون کے مقابلہ میں رام چندر کی جد و جہد، قدامت پسندوں کے مقابلہ میں گوتم کے معرکے، فرعون کے مقابلہ میں موسیٰؑ کا مجاہدہ، نمرود کے مقابلہ میں ابراہیمؑ کا نعرۂ حق، ہیرود کے مقابلہ میں مسیحؑ کا جہاد، یہ سب کش مکش حق و باطل کے تاریخی نمونے ہیں، ان سب میں ہم دیکھتے ہیں کہ باطل کے پاس زبردست مادی قوت موجود ہے۔ اسے حکومت کی طاقت بھی حاصل ہے اور لشکروں کا دبدبہ بھی، اس کے پاس سیم و زر کے انبار بھی ہیں۔ اور اکثریت کی قوت بھی، اس کی ظاہری شان و شوکت ناقابل انکار ہے۔ جگمگاتے ہوئے تاج، جواہرات سے دمکتے ہوئے تخت، سربفلک ایوان، خوبصورت محلات، چمکتی ہوئی تلواریں، لچکتے ہوئے نیزے، آہن پوش لشکری سونے چاندی سے ابلتے ہوئے خزانے غرض یہ کہ جاہ و حشم کا سارا

سامان، جلال وجبروت کے سارے مظاہر، قوت وشوکت کے سارے انداز ملتے ہیں تو باطل کے کیمپ میں ——— اور حق؟ حق بے چارہ ظاہری اعتبار سے حد درجہ ناطاقت ہوتا ہے، کمزور، ناچار، اور مادی حیثیت سے باطل کے مقابلہ میں مجبور محض! ——— لیکن حق کے پاس ایمان کی طاقت ہوتی ہے، خدا کا سہارا ہوتا ہے، روحانی قوتوں کا سرمایہ ہوتا ہے۔ اور اس کے یہ حربے اتنے طاقتور ہوتے ہیں کہ وہ باطل کا سر کچل ڈالتا ہے، اس کے سارے جاہ وجلال کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ اور اس شان سے کامیابی حاصل کرتا ہے کہ دنیا انگشت بدنداں رہ جاتی ہے!

حسینؑ اور یزید کا معرکہ بھی حق اور باطل کا معرکہ تھا ——— جس میں حسینؑ حق کے علمبردار تھے اور یزید باطل کا پرستار، حسینؑ کے پاس صرف ایمان کی قوت اور اللہ کا سہارا تھا اور یزید کے پاس حکومت ——— اور دولت کا زور، کربلا میں دونوں کا ٹکراؤ ہوا، خوفناک اور بھیانک ٹکراؤ، حق کے پرستار شہید ہو گئے۔ ان کے سر نیزوں پر بلند کر دیے گئے۔ ان کی لاشیں روند ڈالی گئیں، ان کی عورتیں قید کر لی گئیں۔ ان کے خیمے جلا دیے گئے۔ ان کا مال واسباب لوٹ لیا گیا۔ غرض یہ کہ ان کو ہر طرح سے تباہ وبرباد کر دیا گیا۔ لیکن پھر فتح کس کی ہوئی؟

یزید کی؟ ——— نہیں ——— فتح حسینؑ کی ہوئی۔ اور اس فتح کا ایک کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ آج دنیا کے کروڑوں ہندو اور مسلمان، عیسائی اور سکھ، حسینؑ کے نام پر جان دیتے ہیں۔ حسینی کہلانے اور حسینؑ سے اپنی وابستگی کا مظاہرہ کرنے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ لیکن یزید کا کوئی نام بھی نہیں لیتا۔ حسینؑ کی قبر پر ہزاروں زائرین اطراف

اکناف عالم سے پہنچتے ہیں، السلامُ علیک یا ابا عبداللہ کے نعروں سے ہر وقت حسینؑ کا روضہ گونجتا رہتا ہے۔ دنیا کے گوشہ گوشہ میں مختلف قومیں حسینؑ کا ماتم کرتی ہیں۔ لیکن یزید کی قبر کا کسی کو نشان بھی نہیں معلوم، یہی نہیں بلکہ اس کا نام آتے ہی انسانیت کی پیشانی پر بل پڑ جاتے ہیں، شرافت و حقانیت کے چہرہ کا رنگ بدل جاتا ہے اور دنیا کا ہر حق پسند انسان خواہ وہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتا ہو یزید کے نام پر نفرین کرتا ہے ——

حسینؑ کی کامیابی کے علم دنیا کے چپہ چپہ میں اُٹھتے ہیں، حسین کا تعزیہ گھر گھر میں رکھا جاتا ہے، حسینؑ کا تابوت ہر بستی میں نظر آتا ہے۔ حسینؑ کے نام کی سبیلیں ہر جگہ دکھائی دیتی ہیں اور آج دنیا کے لاکھوں انسانوں کے نام حسینؑ کے نام پر رکھے جاتے ہیں۔ لیکن کسی کو یزید کہہ دیا جائے تو اس کے ابرووں پر بل پڑ جائیں گے اس لیے کہ آج دنیا کے ہر سلیم العقل انسان کے نزدیک یہ نام گالی بن چکا ہے۔ اور یہ ایک ایسی ابدی اخلاقی شکست ہے جس کے لیے کسی ثبوت کی کوئی ضرورت نہیں ہے!

حسینؑ کو فتح ہوئی اس لیے کہ حسینؑ حق پر تھے اور حق ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے۔ حق کو شکست ہو ہی نہیں سکتی، وہ صرف فتح حاصل کرنا جانتا ہے۔ چونکہ حسینؑ حق کے علمبردار بلکہ مجسمۂ حق تھے اس لیے ان کے لیے بھی شکست کا کوئی سوال پیدا نہیں ہو سکتا۔ ان کو بھی کامیابی ہوئی، فتح ہوئی اور ایسی فتح ہوئی کہ آج ساری دنیا میں ان کی فتح کا پرچم لہرا رہا ہے۔

حق و باطل کے دوسرے معرکوں اور کربلا کی جنگ میں ایک خاص فرق ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس موقعہ پر اسے واضح کرتا چلوں

تاکہ اس بے نظیر معرکہ کا ایک اور بے نظیر رخ آپ کے سامنے آجائے۔
یونان کی سرزمین پر حق و باطل میں ٹکراؤ ہوا تو اکیلا سقراط تھا جس نے زہر کا پیالہ لبوں سے لگا لینا گوارا کیا۔ بابل کی سرزمین پر حق اور باطل میں جنگ ہوئی تو صرف ابراہیمؑ آگ میں کودنے پر تیار ہوئے۔ سرزمین مصر پر حق و باطل میں رزم آرائی ہوئی تو اکیلے موسیٰؑ کو دربار فرعون کے جادوگروں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ فلسطین کی سرزمین پر حق و باطل میں کش مکش ہوئی تو اکیلے مسیحؑ تھے جنھوں نے صلیب کی دعوت قبول کی، سرزمین متھرا پر حق و باطل میں مجاہدہ ہوا تو اکیلے کرشن تھے جو کنس کے مقابلہ میں ڈٹ گئے۔ اور سرزمین لنکا پر حق و باطل میں مجادلہ ہوا تو اکیلے رام تھے جو راون کے مقابلہ میں جان کی بازی کھیل گئے۔ تاریخ گواہ ہے کہ حق والے ہمیشہ تنہا رہے لیکن حسینؑ کا کمال تعلیم تھا کہ جب وہ حق و باطل کے فیصلہ کن محاربہ کے لیے میدان کربلا میں تشریف لائے تو ان کے ساتھ بہتر ۷۲ مردوں اور تقریباً اتنی ہی عورتوں کا پورا قافلہ موجود تھا۔ اور ان سب کے دلوں میں حق پرستی، وہی ایمان، وہی ذوق فداکاری، وہی للّٰہیت و خلوص، وہی جوش فنائیت، وہی ولولۂ دینی، وہی عزم موت اور وہی جذبہ قربانی موجزن تھا۔ استاد نے شاگردوں کو کچھ ایسی کامل تعلیم دی تھی کہ سارے شاگرد استاد کی جیتی جاگتی تصویر بن گئے تھے۔ کربلا کے بن میں حسینؑ کے سارے کے سارے ساتھی حسینؑ تھے۔ حبیب بھی حسینؑ تھے، زہیر بھی حسینؑ تھے، حر بھی حسینؑ تھے، عباسؑ بھی حسینؑ تھے، علی اکبرؑ بھی حسینؑ تھے۔ علی اصغرؑ بھی حسینؑ تھے۔ اور حد تو یہ ہے، کہ زینبؑ بھی حسینؑ تھیں۔ ام کلثومؑ بھی حسینؑ تھیں، سکینہؑ اور رقیہؑ بھی حسینؑ تھیں، غرض یہ کہ حسینیؑ قافلہ کا ہر

فرد حسینؑ تھا۔ یہ ان معنی میں حسینؑ تھے کہ ان کے دل و دماغ ان کے احساس و شعور پر حسینؑ ہی چھائے ہوئے تھے۔ اور حسینؑ نے اپنی بے پناہ تعلیم حق پرستی سے مردوں اور عورتوں کی اس پوری جمعیت کو خود اپنے سانچہ میں ڈھال کے تاریخ عالم میں پہلی بار حق والوں کی اتنی بڑی جماعت تیار کر دی تھی کہ نہ ان سے قبل کبھی تیار ہو سکی اور نہ ان کے بعد کبھی تیار ہونے کی امید ہے!

حسینؑ قافلہ میں جتنے آدمی شریک تھے، خواہ وہ بوڑھے ہوں، خواہ بچے، خواہ عورتیں ہوں، خواہ مرد، سب کے عزائم ایک تھے۔ سب کا طریق کار ایک تھا، سب کی منزل ایک تھی، سب کا مقصد ایک تھا۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ ایک روح حسینیؑ تھی جو بہتّر جسموں میں حرکت کر رہی تھی۔ ایک حسینیؑ ذہن تھا جو بہتّر دماغوں میں جادہ فگن تھا۔ ایک حسینیؑ قلب تھا جو بہتّر سینوں میں دھڑک رہا تھا۔ جدھر حسینؑ کی نگاہ مڑتی تھی اُدھر سب کی نگاہیں مڑ جاتی تھیں، جدھر حسینؑ کے قدم بڑھتے تھے ادھر سب کے قدم بڑھ جاتے تھے، جو کچھ حسینؑ سوچتے تھے، وہی ان کے انصار سوچتے تھے، جو حسینؑ کرنا چاہتے تھے، وہی ان کے ساتھی کرنا چاہتے تھے۔ حسینؑ کے سارے رفقا ایک مشین کے پُرزے تھے اور یہ مشین جس بجلی کے بل چل رہی تھی اس کا نام تھا حسینؑ۔ معرکہ کربلا کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ پوری حسینیؑ جماعت فکر و عمل کے اعتبار سے ایک سانچہ میں ڈھلی ہوئی تھی اور اس میں حق پرستوں کا ایک ایسا عدیم النظیر ڈسپلن (Discipline) کارفرما تھا جس کی مثال حق و باطل کے کسی معرکہ تاریخ میں دستیاب ہونا محال ہے۔

حق و باطل کے مابین دنیا میں جتنے بھی ٹکراؤ ہوئے ان سب میں

حق کے علمبرداروں نے قربانیاں دی ہیں ۔ لیکن ہمیشہ قربانی صرف ایک قسم کی ہوئی ہے ۔ کوئی قتل ہوا ۔ کسی کو جلا وطن ہونا پڑا ۔ کسی کو قید کے شدائد برداشت کرنا پڑے ۔ کسی کا مال لوٹا گیا ۔ غرض یہ کہ صرف ایک قسم کی قربانی پیش کی گئی ۔ لیکن حسینؑ کو دنیا کی ہر امکانی قربانی سے سابقہ پڑا ، انھوں نے اپنا وطن چھوڑا ، عزیزوں اور دوستوں سے منہ موڑا ، سفر کی تکلیفیں برداشت کیں ، تین دن کی بھوک اور پیاس جھیلی ، دوستوں کو قتل ہوتے دیکھا ۔ عزیزوں کو اپنے سامنے ذبح ہوتے ہوئے ملاحظہ فرمایا ۔ بھتیجے کی لاش کی پامالی گوارا کی ۔ بھائی کے شانے کٹتے دیکھے ۔ جوان بیٹے کا جسم پارہ پارہ ہوتے دیکھا ۔ چھ ماہ کا معصوم بچہؑ ان کے ہاتھوں پر تیر ستم کا نشانہ بنا ، خود ان کا سر سجدۂ خالق میں تن سے جدا کیا گیا ۔ ان کا مال لوٹا گیا ۔ ان کے خیمے جلائے گئے ۔ ان کی عورتوں کے سروں سے چادریں تک چھین لی گئیں ، بیبیوں کو قید کر کے کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام تک پھرایا گیا ۔ شام کے قید خانہ میں ان کے اہلبیت کو سال بھر شدید ترین مصائب کا سامنا کرنا پڑا اور حد تو یہ ہے کہ ان کی عورتوں کو اپنے مردوں پر رونے تک کی اجازت نہیں دی گئی !—— اتنی قسم کے مصائب تھے جو بیک وقت حسینؑ کو جھیلنا پڑے اور اسی کی وجہ سے ان کے واقعات میں وہ بے پناہ المیہ تاثر پیدا ہو گیا ہے کہ آج تیرہ سو برس کے بعد بھی جب ان کی داستان سنائی جاتی ہے تو سننے والوں کے دل پھٹنے لگتے ہیں اور جن دلوں میں انسانیت کا ذرا سا بھی درد ہے وہ خون کے آنسو رونے پر مجبور ہو جاتے ہیں ۔

معرکۂ کربلا ، حق و باطل کی تمام لڑائیوں کا نچوڑ ہے ۔ حضرت امام حسینؑ نے یہ ہر قسم کی قربانی پیش کر کے کربلا میں ان تمام واقعات

کو ایک جگہ سمیٹ دیا ہے، جو حق و باطل کے مختلف معرکوں میں پیش آتے رہے ہیں۔ نبیوں، ولیوں، رشیوں اور سنتوں نے مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر حق کی خاطر جتنی قربانیاں دی ہیں وہ سب اکیلے حسینؑ نے صرف ایک دن میں صرف ایک مقام پر پیش کر کے ہمارے لیے قربانیوں اور حقانیت کا ایک خوبصورت گلدستہ تیار کر دیا ہے۔ دوسرے بزرگوں کی ایک ایک قربانی کی مثال ایک ایک پھول کی ہے، انھوں نے نسل انسانی کو صرف ایک ایک پھول دیا۔ حسینؑ نے پورا گلدستہ عطا کر دیا۔ ایسا گلدستہ جس میں رنگ برنگ کے پھول ہیں، جس میں ہر قسم کی خوشبو بیک وقت موجود ہے۔ جس میں تمام سابق علمبرداران حق کی قربانیوں کا پورا نچوڑ ہے، اور شاید یہی وجہ ہے کہ یہ واقعہ دوسرے تمام واقعات کے مقابلہ میں زیادہ اثر آفرین اور زیادہ مشہور ہے۔

کربلا کی داستان سن لیجیے، آپ کو ہر نبی، ہر ولی، اور ہر رشی کی داستان اس میں مل جائے گی۔ ان سب کی حق پرستی اور فداکاری کے جوہر اس ایک واقعہ میں سموئے ہوئے ہیں ان سب کی ایثار و قربانی کی تاریخ اس ایک "کتاب مبین" میں مسطور ہے۔ ان سب کی الٰہی و انسانی خدمات کا پورا نقشہ اس آئینہ میں جلوہ فگن ہے اور ان سب کی للّٰہیت و خلوص کی کہانی اس ایک داستان میں آشکار ہے۔ حسینؑ نہ صرف ہمارے بلکہ دنیا کے تمام مجاہدین حق کے ہیرو ہیں وہ حق کی خاطر جان و مال فدا کرنے والے تمام اللہ والوں کا مظہر اتم ہیں۔ ان کی ایک ذات میں حق پرستی کا جلوہ موجود ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کی بنیاد پر دنیا کا ہر حق پرست انسان خواہ وہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتا ہو حسینؑ سے محبت کرنے پر

مجبور ہے۔ اسے حسینؑ کے غازۂ رُخ میں خود اپنی قوم اور اپنے مذہب کے فداکاروں کا خون جھلکتا نظر آتا ہے۔ وہ حسینؑ کو دیکھتا ہے اور اسے دنیا کے وہ تمام حق پرست یاد آجاتے ہیں جن پر وہ ایمان رکھتا ہے ——— یہی وجہ ہے کہ حسینؑ عالمگیر شخصیت کے مالک ہیں۔ حسینؑ کو صرف مسلمان ہی نہیں، دنیا کے ہر مذہب کے لوگ مانتے اور "اپنا" سمجھتے ہیں، حسینؑ کا نام دنیا کی ہر قوم میں، ہر ملک میں، ہر مذہب میں احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے!

اندازِ جنگ

حسینؑ نے حق کی لڑائی بڑے عجیب انداز سے لڑی ، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ حسینؑ پہلے انسان ہیں جس نے دنیا کو اس جنگ کے انداز سکھائے جو حق والوں کو سچائی اور حقانیت کے تحفظ کی خاطر لڑنا چاہیے۔ حسینؑ سے پہلے ہمیں حق کے جو مجاہد ملتے ہیں ان میں سے بیشتر وہ تھے جنھوں نے انتہائی مجبوری اور مظلومیت کے ساتھ اپنے آپ کو ظلم کی طاقتوں کے حوالے کر دیا اور بے بسی کی موت قبول کر کے دنیا سے سدھار گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مردہ ضمیر زندہ ہو گئے۔ انسانیت جاگ اٹھی اور وہ جن اصلاحات کے طالب تھے وہ ان کی شہادت کے نتیجہ میں خود بخود وجود میں آگئیں۔ بعض دوسرے مجاہدین حق نے عدم تشدد کے اس اصول کے خلاف حق کی حمایت میں تلوار اٹھائی۔ اور ظالموں کا مقابلہ کرتے ہوئے جان دی۔ حسینؑ نے اپنی لڑائی میں ان دونوں اصولوں پر عمل کیا۔ کبھی تو انھوں نے تلوار سے جنگ کی اور کبھی انھوں نے اور ان کے اہل بیتؑ نے عدم تشدد کا حربہ استعمال کیا ——— چنانچہ لڑائی کے ان دونوں طریقوں کے استعمال کا نتیجہ اتنا شاندار نکلا کہ آج تک دنیا اسے سنتی اور اس پر سر دھنتی ہے!

امام حسینؑ کی لڑائی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ، ایک لڑائی کا وہ دور ہے جو مدینہ سے آپ کی روانگی کے وقت سے شروع ہو کر

عاشور کے دن ختم ہوتا ہے اور دوسرا دور ہے جو عاشور کی شام سے شروع ہوکر اہل حرم کی رہائی پر منتج ہوتا ہے۔ اس میں پہلا دور وہ ہے جس میں امام نے ظلم کے مقابلہ میں تلوار کا سہارا لیا اور ظالم کے سامنے سر جھکا دینے کے بجائے شیرانہ انداز میں اس کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ دوسرا دور وہ ہے جب آپ کے بیمار صاحبزادے اور آپ کے گھر کی خواتین نے اسیری کے مصائب برداشت کیے اور قیدی بن کے اہمسا کے طریقوں سے جنگ جاری رکھی۔ یہ دونوں دور ایسے ہیں جن پر تاریخی اعتبار سے نگاہ ڈالنا حد درجہ ضروری ہے اس لیے کہ ان سے حق پرستوں کا ایک خاص انداز جنگ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

پیغمبرؐ اسلام کی وفات کو ابھی پچاس سال گذرے تھے کہ دنیائے اسلام کی حکومت یزید کے ہاتھوں میں آگئی، یزید ایک شرابی، بدکار، فاسق اور ظالم بادشاہ تھا۔ جسے اسلام کی تعلیمات سے دور کا بھی لگاؤ نہیں تھا۔ بادشاہت کے ساتھ ہی اس زمانے کے دستور کے مطابق اس نے پیغمبرؐ اسلام کی جانشینی کا بھی دعویٰ کیا۔ اور مسلمانوں سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ اس کی روحانی سیادت کو تسلیم کریں۔ نیک اور اچھے مسلمانوں کے لیے اس کا یہ مطالبہ قبول کرنا ناممکن تھا، مسلمان یہ جانتے تھے کہ یزید کی شخصیت ازحد غیر اسلامی ہے۔ اور اسلام نے جس پاکیزہ زندگی کی ہدایت دی ہے اس سے یزید یکسر محروم ہے۔ ایسی حالت میں وہ یزید کو پیغمبر اسلام کا روحانی جانشین یا اسلامی اصطلاح میں خلیفہ تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھے۔ لیکن یزید کے پاس طاقت تھی، فوج تھی، حکومت تھی۔ دولت کا زور تھا۔ چنانچہ اس نے کچھ تو روپے کی طاقت سے اور کچھ تلوار کے بل پر مسلمانوں کو اس پر مجبور کر دیا کہ وہ اسے اپنے

نبیؐ کا خلیفہ یا روحانی جانشین تسلیم کرلیں۔ کمزور قسم کے مسلمانوں نے اس کی بیعت کر لی۔ لیکن حضرت امام حسینؑ نے ظلم کی طاقتوں کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا۔ آپ پیغمبرؐ اسلام کے نواسے اور اپنے دَور میں دنیائے اسلام کے سب سے بڑے روحانی رہنما تھے، آپ کی روحانی، اخلاقی اور مذہبی سیادت کو ہر شخص تسلیم کرتا تھا۔ اور تمام سچے مسلمان یہ مانتے تھے کہ نبیؐ کی صحیح روحانی اور مذہبی جانشینی کے لائق اگر کوئی شخص ہے تو وہ آپ ہیں۔ آپ کے روحانی کمالات، اخلاقی فضیلت، علمی برتری، اور فضائل و مناقب سے ہر شخص واقف تھا۔ اور خود یزید بھی ان حقائق کو بخوبی جانتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس پر مصر تھا کہ آپ اس کی بیعت کرلیں۔ اسے یقین تھا کہ اگر آپ نے بیعت کر لی تو پھر کسی مسلمان کے لیے اس کی بیعت سے انکار کی کوئی وجہ باقی نہیں رہے گی۔ اور ساری اسلامی دنیا اس کی بداعمالیوں کو عین اسلام تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے گی ——— یزید کو اپنی طاقت پر ناز تھا۔ اپنی حکومت کا طنطنہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ جس طرح اس نے تلوار کے بل پر دوسرے مسلمانوں کے سر اپنے سامنے جھکوا لیے ہیں۔ اسی طرح وہ آپ کو بھی بیعت پر مجبور کر دے گا۔ لیکن در اصل یہی یزید کی غلطی تھی وہ آپ کی شخصیت، آپ کے بے پناہ عزم، آپ کے جذبۂ فدائیت اور آپ کی قوتِ جہاد کا اندازہ لگانے میں ایک مہلک غلطی کر رہا تھا۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ حسینؑ ایک ایسا طوفان ہیں کہ جب یہ طوفان اٹھ کھڑا ہو گا تو سلطنت بنی امیہ کو خس و خاشاک کی طرح اپنی رو میں بہا لے جائے گا۔ حسینؑ ایک شرر بار صاعقہ ہیں اور جب یہ بجلی چمکے گی تو یزیدیت کے خرمن میں ایک دانہ بھی سلامت نہیں رہ سکے گا۔ حسینؑ ایک آتش فشاں پہاڑ ہیں اور جب یہ جوالا مکھی اپنے پورے جلال کے

ساتھ پھٹے گا۔ تو ظلم کی تمام طاقتیں خاکستر ہو کر رہ جائیں گی۔ یزید نے حسینؑ کو سمجھنے میں غلطی کی، ان کی عظیم صلاحیتوں کا اندازہ لگانے میں غلطی کی، ان کی بے پناہ انقلابی قوتوں کا اندازہ کرنے میں غلطی کی ——— بعد میں اسے انہیں غلطیوں کا خمیازہ ایسے خوفناک طریقوں پر بھگتنا پڑا کہ آج تک دنیا اس کے نام پر نفرین کر رہی ہے۔

حضرت امام حسینؑ مدینہ میں تھے جب آپ سے بیعت کا مطالبہ کیا گیا۔ مدینہ پر یزید کا پرچم لہرا رہا تھا۔ اس کے گورنر نے آپ کو بلایا۔ بادشاہِ وقت کا فرمان سنایا اور بیعت کا مطالبہ کیا۔ آپ نے نہایت صبر و سکون سے اس کی باتیں سماعت فرمائیں۔ اور پھر صاف الفاظ میں بیعت سے انکار کر دیا۔ اس موقعہ پر مروان بھی موجود تھا۔ جو یزید کا رشتہ دار اور پیغمبرؐ اسلام نیز ان کے ..... خاندان کا پرانا دشمن تھا۔ اس نے آپ کو موت کی دھمکی دی لیکن آپ نے اس دھمکی کی پروا نہیں کی اور اپنے مقصد پر کوئی اثر نہ لیتے ہوئے صاف اور غیر مبہم انداز میں اپنے فیصلہ کا اعلان کر دیا اور دارالامارۃ سے اپنے گھر واپس چلے گئے۔ آپ کی جنگ کا آغاز دراصل اسی مقام سے ہوتا ہے!

آپ خونریزی پسند نہیں کرتے تھے اس لیے آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ مدینہ چھوڑ دیا جائے چنانچہ آپ مع اپنے اہل و عیال کے مدینہ سے مکہ روانہ ہو گئے۔ آپ کی یہ ہجرت بڑی معنی خیز تھی اور آپ کی جنگ کا یہ ایک خاص انداز تھا جو آپ نے اختیار کیا تھا۔ مدینہ سے آپ کی اچانک ہجرت نے مسلمانوں کو متوحش کر دیا اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے۔ کہ آخر حسینؑ نے اپنے نانا کا روضہ کیوں چھوڑ دیا؟ اپنا گھر بار کیوں تج دیا؟ بے وطنی کیوں اختیار کر لی؟ ماں کی قبر اور بھائی

کے مدفن سے کیوں جدا ہو گئے اور وہ کیا حالات ہیں جن میں نبیؐ کے دل کے ٹکڑے نبیؐ کی خواب گاہ کو چھوڑ دینے پر مجبور ہو گئے؟ آپ کے ترک وطن سے مسلمانوں کے دلوں پر چوٹ لگی ان پر یزید کے ظالمانہ انداز ظاہر ہوئے اور وہ یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو گئے کہ اسلامی دنیا میں ضرور کچھ ایسے واقعات نمودار ہو رہے ہیں جن میں اسلام کا جیتا جاگتا نمونہ، حسینؑ، زندگی پر موت کو ترجیح دینے پر مجبور ہو گیا ہے!

حسینؑ چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں یہ احساس پیدا ہو، ان کے مردہ ضمیر جاگیں، ان کی نگاہوں سے غفلت کے پردے اٹھیں اور وہ یہ سمجھیں کہ ایک زانی، شرابی، بدکار، تارک الصلوٰۃ ظالم بادشاہ کی بیعت اسلام کے اصولوں کے منافی ہے، اسلام کسی حالت میں اس چیز کو برداشت نہیں کر سکتا اور اگر مسلمان اسی طرح بے سوچے سمجھے ہر شخص کو خلیفہ تسلیم کرتے اور اس کی بیعت کرتے رہے تو اسلام کا خاتمہ ہو جائے گا! ——— حسینؑ نے مدینہ سے ترک وطن کر کے اس احساس کا بیج بو دیا اور یہ وہ پہلی ضرب تھی جو آپ کی جانب سے اس یزیدیت پر لگائی گئی جس نے ضمیروں کو مردہ، عقلوں کو مفلوج اور ایمان کو مضمحل کر کے اسلام کی جڑیں کھوکھلی کرنا شروع کر دی تھیں!

آپ مکہ پہنچے، حج کا زمانہ تھا۔ دنیا کے گوشہ گوشہ کے مسلمان کعبہ کے سائے میں موجود تھے۔ وہ مسلمان جو حسینؑ کو اپنا روحانی رہنما تسلیم کرتے تھے، جن کو معلوم تھا کہ حسینؑ ان کے رسولؐ کے چہیتے نواسے اور اسلام کے جیتے جاگتے پیکر ہیں۔ جو اس حقیقت سے واقف تھے کہ حسینؑ اللہ کے پیارے نبیؐ کے دُلارے ہیں۔ اور جن کو یہ معلوم تھا کہ حسینؑ ان اہل بیت میں شامل ہیں جن کو پیغمبرؐ اسلام نے مسلمانوں کی دینی قیادت سپرد کی تھی۔ تمام مسلمانوں کی نگاہیں حسینؑ پر مرکوز تھیں۔ لیکن اچانک

حج سے ایک دن قبل حسینؑ نے مکہ چھوڑ دیا اور حج کیے بغیر عراق روانہ ہو گئے۔

یہ واقعہ ایسا نہیں تھا کہ مسلمان اسے نظر انداز کر دیتے۔ حسینؑ سا عاشق الٰہی اور حج نہ کرے، حسینؑ سا پابندِ شریعت اور سنتِ ابراہیمیؑ ترک کر دے؟ حسینؑ سا عاشق اسلام اور مذہب کے ایک اہم رکن کی ادائیگی سے محترز رہے؟ آخر کیوں ——؟ یہ ایک سوال تھا جو ہر مسلمان کے ذہن میں پیدا ہوا اور اس سوال کا جواب نفسیاتی طور پر یزید کے لیے جتنا مہلک ہو سکتا تھا، وہ ہم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ مکہ میں جمع ہونے والے مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ یزید نے حسینؑ سے بیعت کا مطالبہ کیا ہے اور حسینؑ نے یہ مطالبہ قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے —— کیوں؟ اس لیے کہ حسینؑ ایک بدکار، عیاش اور ظالم سلطان کو پیغمبرؐ اسلام کا خلیفہ، مسلمانوں کا روحانی رہنما اور اسلام کا ہادی و رہبر تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہیں، حسینؑ کے نزدیک ایسے بادشاہ کی اطاعت کرنا اسلام کی موت کے مترادف ہے اور حسینؑ اسلام کی موت کے مقابلہ میں خود اپنی اور اپنے بچوں کی موت کو ترجیح دیتے ہیں! —— یہ تھے وہ خیالات جو حسینؑ نے مکہ چھوڑ کے حاجیوں کے ذہنوں میں پیدا کر دیے اور جب مکہ سے لوگ اپنے اپنے شہروں کو واپس ہوئے تو ان کے ذریعہ سے یہی تصورات ساری دنیائے اسلام میں عام ہو گئے —— یزیدیت پر یہ دوسری ضرب تھی، جو حسینؑ نے صادر کی، اہمسا کا یہ دوسرا حربہ تھا جو حسینؑ نے استعمال کیا، اور اس کے جو نتائج بعد میں رونما ہوئے یزید کی مخالفت جس طرح عام ہوئی، اور دنیائے اسلام میں یزید کے خلاف جو عام ہیجان پیدا ہوا وہ تاریخ اسلامی کے طلبہ سے پوشیدہ

نہیں ہے!

حسینؑ مکہ سے کوفہ روانہ ہوئے انھوں نے اپنے ہراول کے طور پر اپنے چچا زاد بھائی مسلم بن عقیل کو پہلے ہی کوفہ روانہ کر دیا تھا۔ کوفہ میں مسلم کی آمد کے نتیجہ میں پورے عراق میں یہ خبر عام ہو گئی تھی کہ اسلام کے پیکر حقیقی، حضرت امام حسینؑ نے یزید کی بیعت سے انکار کر دیا ہے اور یزید کے سے سلطان کو خلیفہ رسول تسلیم کرنا اسلام کے اصولوں کی کھلی ہوئی توہین ہے۔ کوفہ میں یزید کے گورنر عبید اللہ بن زیاد نے مسلم کی گرفتاری کا حکم صادر کر دیا، مسلم تنہا تھے کوئی شخص ان کا ساتھ دینے پر تیار نہ تھا، مسلمانوں کا کردار اتنا گر چکا تھا اور وہ اس حد تک خوف زدہ، مرعوب اور بزدل ہو چکے تھے کہ ان میں حق کا ساتھ دینے کی جرأت باقی نہیں رہی تھی۔ وہ اپنے دل کے پردوں میں مسلم اور ان کے پیغام کی صداقت کو تسلیم کرتے تھے لیکن ان میں باطل کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں تھی، وہ اس حد تک پست اور ذلیل ہو چکے تھے کہ ابن زیاد محض چند ٹکوں میں ان کو خرید سکتا تھا چنانچہ مسلم نے دیکھا کہ وہ کوفہ میں بالکل تن و تنہا ہیں، ان کا کوئی ساتھی نہیں ہے ان کو سر چھپانے کے لیے بھی کوئی جگہ نہیں مل سکتی ہے ان کو کوئی کھانا کھلا دینے یا پانی پلا دینے کا بھی روادار نہیں ہے۔ ان حالات میں اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اپنی بے چارگی کے پیش نظر ابن زیاد کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا۔ اس کی اطاعت قبول کر لیتا۔ خاموشی کے ساتھ اپنی گرفتاری پر راضی ہو جاتا۔ اور پھر حاکم وقت سے جان کی امان طلب کرتا ——— لیکن مسلمؑ حسینؑ کے مکتب فکر کے پروردہ تھے۔ انھوں نے حق کی جنگ لڑنے کے انداز حسینؑ سے سیکھے تھے، وہ زندگی

کے مقابلہ میں حق کو فضیلت دیتے تھے اور ان کو حق کی عظمت آشکار کرنے کے طریقے خوب معلوم تھے ـــــ انھوں نے خاموشی کے ساتھ گرفتار ہونے سے انکار کر دیا۔ اور تن تنہا ابن زیاد کے لشکر کے مقابلہ میں ڈٹ گئے، جنگ ہوئی، اور بڑی عجیب و غریب جنگ؛ ایک طرف پندرہ سو آدمیوں کا لشکر تھا اور دوسری طرف تن تنہا مسلم ـــــ شہر والے حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے اور یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ آخر مسلم کیوں لڑ رہے ہیں؟ ان کو موت کا خوف کیوں نہیں ستاتا؟ جس طرح ہم نے موت کے ڈر سے ابن زیاد کی اطاعت قبول کر لی ہے اسی طرح مسلم کیوں نہیں اس کی اطاعت قبول کر لیتے؟ جس طرح ہم یزید کے ہاتھ بک گئے اسی طرح مسلم کیوں نہیں بک جاتے؟ مسلم کو دشمن کی طاقت اور کثرت کیوں نہیں مرعوب کرتی؟ تن تنہا ایک لشکر کے مقابلہ میں رزم آزما ہونے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟ محض ایک اصول کی خاطر جان دینے کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے؟ اور کیا حق اتنا قیمتی ہے کہ اس کی خاطر جان بھی دی جا سکتی ہے؟ اور کیا حق کی حمایت اتنی ضروری ہے کہ آدمی کو اس کے لیے تن تنہا بھی ایک پوری حکومت سے ٹکر لے لینا چاہیے؟ ـــــ یہ ہوں گے وہ سوالات جو لازماً ہر کوفہ والے کے دل میں پیدا ہوئے ہوں گے، اور مسلم کا اس جنگ سے مقصد ہی ذہنوں میں یہ سوالات پیدا کر دینا تھا! ـــــ مسلم یہ جانتے تھے کہ وہ اکیلے حکومت کو شکست نہیں دے سکتے، ان کو معلوم تھا کہ ان کی لڑائی ہار پر، بلکہ موت پر ختم ہو گی، وہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ اس جنگ کا نتیجہ کسی حالت میں بھی فتح نہیں ہو سکتا، لیکن اس کے باوجود انھوں نے جنگ کی، شہر کے ہر گلی کوچہ میں لڑے آدھے دن تک لڑتے

رہے اور اس طرح انھوں نے عراقی مسلمانوں کو یہ بتلا دیا کہ ——— حق کی حمایت میں آواز بلند کرنا ہر انسان کا فرض ہے، حق کی حمایت کرنے والوں کو قلّتِ تعداد سے مایوس اور خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے، حق کی حمایت میں تنہا رہتے ہوئے بھی پوری حکومت سے ٹکر لینے میں کوئی خوف محسوس نہیں کرنا چاہیے۔ اور حق اتنی قیمتی شے ہے کہ اس کے مقابلہ میں جان کی کوئی وقعت نہیں ہے۔

انھوں نے عراقیوں پر یہ بھی واضح کر دیا کہ یزید کی بیعت کرنے کے مقابلہ میں ایک سچے مسلمان کے لیے یہ کہیں بہتر ہے کہ وہ مر جائے، انھوں نے اپنے کردار سے یہ ثابت کر دیا کہ ایک جابر و ظالم سلطان کے خلاف تلوار اٹھانا اور اس کا مقابلہ کرنا ہر شخص کا فرض ہے۔ انھوں نے مر کے یہ تعلیم دے دی کہ بزدلانہ انداز میں ایک حکومت جبر کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا انسانیت اور اسلام کی تعلیم کے خلاف ہے، انسانیت اور شرافت یہی ہے کہ موت کی پروا نہ کرتے ہوئے حقانیت کا پرچم بلند رکھا جائے!

مسلم شہید کر دیے گئے، ان کی لاش شاہی محل کے برآمدے سے نیچے پھینک دی گئی اور پھر اس کی سارے شہر میں تشہیر کی گئی، مسلم کا سر دروازہ شہر میں آویزاں کر دیا گیا۔ ان ہزار کوفیوں نے، جو اسلام کے مدعی تھے، جو پیغمبرؐ اسلام کا کلمہ پڑھتے تھے۔ جو رسولؐ اللہ کے نام لیوا تھے یہ منظر دیکھا اور یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ ابن زیاد ظالم ہے۔ مسلم مظلوم تھے، ان کے ساتھ انسانیت سوز سلوک کیا گیا۔ ان کو زخمداری کی حالت میں پانی نہ دینا اور پیاسا ذبح کر کے ان کی لاش کو شہر کے گلی کوچوں میں پھرانا انسانیت پر ظلم کرنا ہے، ایسے ظالم ہرگز حق پر نہیں کہے جا سکتے ایسے ظالموں کے ہاتھوں میں اپنی عنان حکومت دے دینا خود اپنے اوپر

ظلم کرنا ہے۔ عقل و انسانیت کا اقتضا یہی ہے کہ ایسے ظالموں کی بیعت کرنے کے بجائے ان کا مقابلہ کرتے ہوئے جان دے دی جائے، موت قبول کی جائے، لیکن ایسے حکمرانوں کی غلامی گوارا نہ کی جائے!

یہ صحیح ہے کہ ہر انسان میں حق پر مر مٹنے کی جرأت نہیں ہوتی اور یہی وجہ ہے کہ کوفہ میں ابن زیاد کے خلاف کوئی فوری بغاوت نہیں ہو سکی لیکن پھر بھی یہ ضرور ہوا کہ کوفہ کے چند جرأت مند انسانوں کے دلوں میں حقانیت کا نور پیدا ہوا۔ اور وہ ابن زیاد کے مظالم کے باوجود حسینؑ کا ساتھ دینے پر تیار ہو گئے ——— چنانچہ جب کربلا کے شہیدوں پر نظر ڈالی جاتی ہے تو ان میں کوفہ والوں کی اکثریت نظر آتی ہے، حبیب ابن مظاہر، مسلم بن عوسجہ، حر بن یزید، ریاحی، عابس بن شبیب شاکری، اور حسینی قافلہ کے بہت سے دوسرے حضرات کوفہ کے رہنے والے تھے اور یہ وہی لوگ تھے جو مسلم کی حق پرستانہ جنگ سے اتنے متاثر ہوئے تھے کہ انھوں نے بھی حق کی خاطر سروں سے کفن باندھ کر میدان میں کود پڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا!

مسلم کی شہادت حسینؑ کی تیسری ضرب تھی جو یزیدیت پر عائد کی گئی تھی اور اس کا نتیجہ بھی حسینؑ کے حق میں خاطر خواہ نکلا، اس کے نتیجہ میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو گیا۔ اور دنیا نے یہ دیکھ لیا کہ حسینؑ کا فلسفۂ حیات حق پر مرجانا ہے باطل کی غلامی نہیں!

حسینؑ عراق کی سرحدوں میں داخل ہوئے تو ابن زیاد کے ایک لشکر نے جو حُر کی قیادت میں روانہ کیا گیا تھا۔ آپ کا راستہ روکا، حُر ٹھیک دوپہر کے وقت جب گرمی کی وجہ سے عرب کی ریتی آگ کی طرح تپ رہی تھی آپ کے قافلہ کے نزدیک پہنچا، اس کا سارا لشکر پیاسا تھا۔ اور دور دور تک کہیں پانی کا نام و نشان نہیں تھا۔ حُر کے ساتھ ایک ہزار

آدمی تھے اور آپؑ کے قافلہ میں اس وقت تین ہزار آدمی موجود تھے۔ آپ کے ساتھیوں کی یہ رائے ہوئی کہ ہم اس وقت جنگ کر کے لشکر مخالف کو شکست دے دیں لیکن آپ کا انداز جنگ وہ نہیں تھا جو فاتحین کا اندازِ جنگ ہوا کرتا ہے۔ آپ کا انداز جنگ حق پرستوں کا اندازِ جنگ تھا۔ آپ نے جنگ کے بجائے حُرؑ اور اس کے ساتھیوں کو پانی پلایا۔ یہ سپاہی جن گھوڑوں پر آئے تھے، وہ بھی پیاس سے زبانیں باہر نکالے ہوئے تھے، آپ نے گھوڑوں کو سیراب کیا اور اس طرح حُرؑ اور اس کے ساتھیوں پر یہ واضح کر دیا کہ آپ انسانیت کے اصولوں کے پاسدار ہیں، آپ جس حق اور انسانیت کے قیام کے لیے نکلے ہیں، اس کے اصولوں کا جنگ میں بھی لحاظ رکھتے ہیں اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ آئندہ خود آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو پانی کا ایک قطرہ بھی نصیب نہیں ہوگا دشمن کے لشکر کو سیراب کر دینا اس لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ انسانیت اور حقانیت کا اقتضا یہی ہے کہ پانی کی موجودگی میں کسی انسان کو خواہ وہ اپنا دشمن ہی کیوں نہ ہو پیاسا نہ رہنے دیا جائے!——

آپ نے حُرؑ کی فوج کو سیراب کر کے خود یزیدی لشکر کے سامنے حق اور باطل کا فرق واضح کر دیا—— ایک طرف حسینؑ ہیں جو دشمن کے گھوڑوں تک کو پیاسا نہیں دیکھ سکتے جو خود اپنا پیاسا رہنا قبول کرتے ہوئے دشمن کو سیراب کر دیتے ہیں اور دوسری طرف یزید ہے جس کے قانون میں چھ ماہ کے بچہ کی پیاس بھی تین بھال کے تیر سے بجھائی جاتی ہے جس کی شریعت میں پیغمبرؐ کے گھرانے کو تین دن کا بھوکا پیاسا ذبح کر ڈالا جاتا ہے اور جس کی انسانیت دشمنی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ حسینؑ کی قیدی عورتوں اور پیاسی بچیوں کو پانی دکھا دکھا کے زمین پر بہایا جاتا ہے اور اس ظلم پر قہقہے لگائے جاتے ہیں!

دنیا کا کوئی سلیم العقل انسان اس فرق کو نظر انداز نہیں کر سکتا، حسینؑ حکومت کے خواہش مند ہوتے تو حُر کی فوج کو پیاس سے تڑپنے کے لیے چھوڑ دیتے اور چونکہ آپ کے پاس حُر سے زیادہ فوج بھی موجود تھی اس لیے پیاس سے تڑپتے ہوئے دشمنوں پر حملہ کر کے اس کا کام تمام کر دیتے۔ اس ظاہری فتح سے آپ کے ساتھیوں کی ہمت بڑھ جاتی، ممکن ہے کہ مختلف اسلامی ممالک میں وہ لوگ جو یزید کی اطاعت کیے ہوئے تھے۔ اس فتح کی خبر سن کے یزید کے خلاف بغاوت کا پرچم بلند کر دیتے، خود کوفہ والوں کی ہمت بڑھ جاتی اور ابن زیاد کا تختہ الٹ دیا جاتا ——— لیکن یہ فتح عارضی ہوتی یہ تلوار کی فتح ہوتی جس میں فاتح صرف انسانوں کے سر اپنے سامنے جھکواتا ہے۔ حسینؑ ابدی فتح چاہتے تھے، حق کی فتح، جس میں فاتح انسانوں کے دل اپنے سامنے جھکواتا ہے ——— آپ نے سیاست یا وقتی مصالح پر حق کے مصالح کو ترجیح دی، آپ کو حکومت کی خواہش نہیں تھی، حق کے قیام کی خواہش تھی، اور قیام حق کے سلسلے میں آپ کی یہ چوتھی ضرب تھی جس نے خود یزیدی لشکر کے سپاہیوں کے دلوں پر یہ حقیقت منکشف کر دی، کہ حسینؑ انسانیت، حقانیت، اور اسلام کے علمبردار ہیں، حسینؑ ایک سچے ولی اللہ ہیں، حسینؑ کی جنگ حکومت کے لیے نہیں ہے، حسینؑ قیام حق کے لیے ظلم کی طاقتوں سے لڑ رہے ہیں، حسینؑ اصول پسند انسان ہیں، ان کی جنگ کسی انسان کے خلاف نہیں ہے ان کے دل میں اپنے دشمنوں کے لیے بھی کوئی نفرت نہیں ہے۔ اور اگر وہ میدان میں آئے ہیں تو اس لیے نہیں کہ یزید کا خاتمہ ہو جائے بلکہ ان کا مقصد اس یزیدیت کو ختم کرنا ہے، جو ظلم، جبر، انسانیت دشمنی اور باطل پرستی کی کھلی ہوئی مظہر ہے!

حسینؑ نے حُر سے جنگ نہیں کی اور اپنی امن پسندی کے اظہار کے لیے اپنا راستہ بدل دیا آپ کوفہ کے بجائے ایک دوسری سمت روانہ ہو گئے تاکہ آپ کے دامن پر جنگ جوئی کا الزام نہ لگ سکے۔ حُر کی فوج پھر بھی آپ کے ساتھ ساتھ رہی یہاں تک کہ کربلا کے غیر آباد علاقہ میں پہنچ گئے۔ یہاں پہنچ کر حُر کو ابن زیاد کا حکم ملا کہ وہ آپ کو آگے نہ بڑھنے دے چنانچہ حُر نے راستہ روک دیا اس وقت بھی آپ کے پاس حُر سے زیادہ آدمی موجود تھے اور اگر آپ چاہتے تو جنگ کر کے اسے شکست دے سکتے تھے لیکن آپ امن پسند تھے اور تشدد کے اصولوں سے کوئی کام نکالنا نہ چاہتے تھے، حُر نے آپ کو روکا تو آپ نے دریائے فرات کے کنارے اپنے خیمے لگا دیے۔ دوسرے ہی دن ابن زیاد کا سپہ سالار عمر سعد ایک بڑا لشکر لے کر کربلا پہنچ گیا۔ اور اس نے حکم دیا کہ آپ اپنے خیمے نہر کے کنارے سے ہٹالیں آپ چاہتے تو اس وقت بھی لڑ سکتے تھے اس لیے کہ اب بھی آپ کے پاس کافی سپاہی موجود تھے اور عمر سعد کا لشکر کم تھا۔ آپ نے اہمسا کے اصول پر عمل کیا اور اپنے خیمے دریا سے دور ایک چٹیل میدان میں لگا دیے، آپ کا یہ اقدام کسی کمزوری کی بنیاد پر نہیں تھا۔ آپ خود بے حد بہادر تھے اور آپ کے ساتھ عرب کے بہادروں کی ایک پوری جماعت موجود تھی اس لیے اگر صرف حصولِ حکومت کا جذبہ کارفرما ہوتا تو آپ ہرگز اس موقع پر خاموش نہ رہتے اور دریا کا کنارا چھوڑ دینے کے بجائے تلوار کا سہارا لے کر میدان میں آجاتے لیکن یہ ایک حق پرست کی جنگ تھی اور حق پرستوں کی جنگ کا انداز عجیب ہوا کرتا ہے آپ دنیا کو یہ بتلانا چاہتے تھے کہ حق پرست امن پسند ہوتے ہیں اور جب تک پانی سر سے نہ گذر جائے تب تک وہ کسی حالت میں جنگ نہیں کرتے

آپ خود یزیدی لشکر کے سپاہیوں پر اتمام حجت کرنا چاہتے تھے اور ان کو یہ دکھا دینا چاہتے تھے کہ میں امن پسند ہوں اور یزید جنگجو، میں جنگ نہیں کرنا چاہتا یزید جنگ چاہتا ہے، میں خونریزی کا طالب نہیں ہوں یزید خونریزی کا طالب ہے، میں مظلوم ہوں اور یزید ظالم، میں اہمسا کا شیدائی ہوں اور یزید تشدد کا پرستار، میرا جرم صرف اتنا ہے کہ میں حق کا اعلان کرتا ہوں اور یزید کا مقصد یہ ہے کہ حق کا اعلان کرنے والوں کو ذبح کر ڈالا جائے۔ میں جنگ کرنے کے لیے گھر سے نہیں نکلا ہوں بلکہ امن و سکون کی فضا میں حق کا اعلان کرنا چاہتا ہوں یزید اعلان حق کو دبانا چاہتا ہے اور صرف اسی مقصد سے میرے مقابلہ میں لشکر بھیج رہا ہے —— آپ کا یہ مقصد حاصل ہوا۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ خود عمر سعد نے اس کا اقرار کیا ہے کہ آپ امن پسند ہیں اور یزید جنگ جو، آپ باعزت صلح چاہتے ہیں لیکن یزید اور ابن زیاد کا یہ حکم ہے کہ آپ کو مار ڈالا جائے۔

آپ کی یہ پانچویں ضرب تھی جو یزیدیت پر عائد کی گئی۔ اس نے خود یزید کے لشکریوں سے آپ کی امن پسندی، انسانیت اور حقانیت کا اعتراف کرالیا!

آپ نے خیمے ہٹا لینے کے بعد عمر سعد سے گفتگو شروع کی اور اس کے سامنے تین تجاویز پیش کیں!

(۱) مجھے مدینہ واپس چلا جانے دو۔

(۲) اگر تم اس پر تیار نہیں ہو تو مجھے یزید کے پاس لے چلو میں اس سے گفتگو کر لوں گا!

(۳) اگر یہ بھی ممکن نہیں تو مجھے یزیدی سلطنت کے حدود سے باہر نکل جانے دو تاکہ تمھیں میری جانب سے کوئی اندیشہ باقی نہ رہے۔

عمر سعد نے یہ تجاویز ابن زیاد کو بھیج دیں۔ اور یہ سفارش کی کہ جنگ کے بجائے ان میں سے کوئی ایک تجویز قبول کر لی جائے۔ یہ آپ کی بہت بڑی فتح تھی اس لیے کہ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ خود دشمن بھی آپ کی امن پسندی کا معترف تھا اور عمر سعد کے سے شخص کو بھی یہ تسلیم کرنا پڑ رہا تھا کہ آپ سے جنگ کرنا یا آپ کو قتل کر دینا غلط ہے۔

ابن زیاد نے ساری تجاویز مسترد کر دیں اور حکم بھیجا کہ حسینؑ کو قتل کر دیا جائے۔ عمر سعد کو چونکہ آپ کی حقانیت کا احساس تھا اور وہ بھی یہ جانتا تھا کہ اتنے بڑے ولیٔ خدا کو قتل کر دینا ایک سنگین جرم ہے۔ اس لیے اس نے پھر ابن زیاد کو خط لکھا اور صلح کی ترغیب دلائی۔ ابنِ زیاد نے اس کے جواب میں جو جملہ لکھا وہ ہمارے لیے بیحد توجہ کے قابل ہے۔ اس نے لکھا کہ ——

"میرا حکم ہے کہ حسینؑ کو قتل کر دے اگر تو یہ کام نہیں کر سکتا تو فوج کی سپہ سالاری کے عہدہ سے ہٹ جا اور یہ بھی یاد رکھ کہ جو گاؤں اس کام کے صلہ میں تجھے بطور جاگیر دیے جانے کا وعدہ کیا گیا ہے اس سے بھی تو محروم ہو جائے گا۔"

عمر سعد کے لیے یہ بہت بڑا سوال تھا —— فوج کی سالاری اور رے کی جاگیر —— اور اس کے مقابلہ میں حسینؑ اور آلِ رسولؐ کا قتل۔ اسے اِن دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا!

وہ جانتا تھا کہ حق حسینؑ کے ساتھ ہے، اسے یقین تھا کہ اگر اس نے حسینؑ کو قتل کر ڈالا تو اسے جہنم کے سوا اور کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ اس کا ایمان تھا کہ حسینؑ اللہ کے پیارے بندے پیغمبرؐ اسلام کے چہیتے نواسے، اور اسلام کے جیتے جاگتے نمونے ہیں اسے معلوم تھا کہ حسینؑ کا قتل ظلم ہے، گناہ ہے، ناقابل عفو جرم ہے اور اس کے نتیجہ میں

اسے قیامت تک روسیاہی نصیب ہوگی ـــــ لیکن پھر سالاری کا عہدہ اور ایک گاؤں بطور جاگیر؟ ـــــ اس دنیاوی فائدہ سے کیسے منہ موڑ لیا جائے؟ سپہ سالاری کی عزت کیسے چھوڑ دی جائے؟ جاگیر کی آمدنی سے کس طرح کنارہ کشی کی جائے؟ ـــــ یہ تھے وہ مسائل جن سے عمر سعد دوچار تھا؟ اسے دین اور دنیا میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ حق اور باطل میں سے کسی ایک کو اپنے لیے اختیار کرنا تھا۔ نور اور نار میں سے کسی ایک کو چننا تھا! ـــــ اس نے دین پر دنیا کو اور حق پر باطل کو ترجیح دی اور محض ایک عارضی عہدے اور ایک جاگیر کی خاطر قتل حسینؑ پر آمادہ ہوگیا!

یزیدیت پر یہ ایک اور ضرب تھی جو حسینؑ کی جانب سے عائد کی گئی۔ حسینؑ نے آنے والی نسلوں پر یہ واضح کر دیا کہ اس وقت جبکہ آپ ایک اصول کے لیے لڑ رہے تھے آپ کے مخالفین محض دنیاوی عہدوں اور ذاتی انتفاع کے لیے میدان میں آئے تھے۔ یہ یزید کی ایک زبردست شکست تھی، ایسی شکست جس پر پردہ ڈالنا محال ہے!

عمر سعد نے ساتویں محرم سے نہر پر پہرہ بٹھا دیا اور حسینؑ کے بچوں پر پانی بند کر دیا!

یزیدیت کی یہ ایک اور شرمناک اخلاقی شکست تھی۔ اگر یہ لوگ کسی اصول کے لیے لڑ رہے ہوتے تو پانی بند کرنے کی انسانیت سوز حرکت ہرگز نہ کرتے۔ یزیدیوں کے اس اقدام نے ثابت کر دیا کہ وہ وحشیانہ اور بہیمانہ کردار کے مالک تھے، ان کے دلوں میں انسانیت یا اس کی قدروں کا کوئی احساس نہیں تھا اور وہ اتنے ظالم تھے کہ محض عارضی دنیاوی فائدوں کی خاطر ننھے ننھے بچوں اور بے بس و کمزور خواتین کو پیاسا مار ڈالنے پر تلے ہوئے تھے!

اُدھر کوفہ سے دھڑا دھڑ فوجیں کربلا پہنچ رہی تھیں اور اِدھر امام حسینؑ

اپنے ساتھیوں کو کم کرتے جارہے تھے۔ آپ پوری صفائی سے ان لوگوں کو جو آپ کے ہمراہ تھے یہ ہدایت کر رہے تھے کہ وہ آپ کو چھوڑ کر چلے جائیں تاکہ عاشور کی آخری فیصلہ کن جنگ کے وقت آپ کے ساتھ صرف ان مخلصین کی جماعت باقی رہ جائے جو حق کی خاطر پوری جی داری سے اپنے آپ کو قربان کر سکے ۔

ایک طرف لشکر جمع ہو رہے تھے اور دوسری طرف ساتھی کم کیے جا رہے تھے، ایک طرف سلطنت کی خاطر جنگ کرنے والے تھے جو بادشاہوں کے انداز میں اپنی مادی طاقت کو بڑھاتے جا رہے تھے اور دوسری طرف حق کی خاطر قربانیاں دینے والے تھے۔ جو حق پرستوں کے انداز میں اپنی ظاہری قوت کو کم سے کم تر کرتے جا رہے تھے، ایک سمت ظلم کی طاقتیں بڑھتی جا رہی تھیں اور دوسری سمت مظلومیت اور امن پسندی کا اظہار کیا جا رہا تھا ——— یزیدیت پر یہ ایک اور ضرب تھی جو حسینؑ کی جانب سے عائد کی جا رہی تھی اور اس کے ذریعہ سے دنیا پر واضح کیا جا رہا تھا کہ یزید جنگ کا طالب ہے اور حسینؑ امن اور قربانی کے علمبردار!

محرم کی نویں کو شام کے قریب شمر بن ذوالجوشن تین ہزار سپاہیوں سمیت کربلا پہنچا اور ابن سعد کو ابن زیاد کا یہ حکم پہنچایا کہ "یا تو فوراً حسینؑ پر حملہ کرو ورنہ سپہ سالاری کا عہدہ شمر کے سپرد کر دو! ——— عمر سعد کے لیے یہ دھمکی بہت کافی تھی چنانچہ اس نے پورے لشکر کو کوچ کا حکم دے دیا۔ امام کو حملہ کی اطلاع ملی۔ آپ نے اپنے بھائی عباسؑ کو بھیجا کہ ان لوگوں سے ایک رات کی مہلت لے لو تاکہ ہم اس رات کو جی بھر کے خدا کو یاد کر لیں! حضرت عباسؑ فوراً روانہ ہوئے اور آپ نے لشکر مخالف کو روک کے عمر سعد کو امام کا پیغام پہنچا دیا۔ عمر سعد کو یہ خوف ہوا کہ اگر میں نے حسینؑ کو عبادت کے لیے ایک رات کی مہلت دے دی تو میرا عہدہ سلب ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے اجازت دینے سے انکار کر دیا لیکن اس پر خود دشمن کے لشکر میں پھوٹ پڑ گئی۔ لوگوں نے کہا کہ حسینؑ کہیں بھاگ نہیں جائیں گے۔ وہ اگر عبادت کے لیے ایک رات کی مہلت طلب کرتے ہیں تو اس میں کیا حرج ہے؟ حسینؑ

رسولؐ کے نواسے ہیں، انھیں کے گھر سے عبادت کا رواج ہوا ہے، وہ بڑے عبادت گذار ہیں اگر وہ ایک رات کی مہلت صرف اس لیے چاہتے ہیں کہ اپنے رب کو جی بھر کے یاد کر لیں تو ان کو یہ مہلت ضرور دی جانا چاہیئے۔

یہ ایک اور ضرب تھی جو علمبردار امن و روحانیت نے یزیدیت پر عائد کی، لشکر یزید خونریزی پر مائل ہے اور حسینؑ عبادت کے لیے مہلت مانگ رہے ہیں۔ ایک طرف قاتلوں کا گروہ ہے اور دوسری طرف عبادت گذاروں کی جماعت، ایک سمت وہ لوگ ہیں جو بے جرم و بے خطا انسانوں کو محض دنیاوی فائدوں کے لیے ذبح کر ڈالنا چاہتے ہیں اور دوسری سمت وہ لوگ ہیں جو موت کے سائے میں بھی اپنے خدا کو یاد کرنا چاہتے ہیں۔ ایک بڑا فرق ہے ان دونوں میں اور خود یزیدی لشکر کے سپاہی بھی اس فرق کو سمجھ رہے تھے، اس حد تک سمجھ رہے تھے کہ انھوں نے عمر سعد کو، اندھے دنیادار عمر سعد کو، اس پر مجبور کر دیا کہ وہ عابد و زاہد حسینؑ کو ایک رات کی مہلت دے دے۔ یزیدی لشکر کا حسینؑ کے ذوق عبادت کو تسلیم کر لینا حسینؑ کی حقانیت کو تسلیم کر لینے کے مترادف ہے اور یہ ایک ایسی شکست ہے جو یزید کو خود اس کے ساتھیوں کے ہاتھوں نصیب ہوئی ہے!

عاشور کی ساری رات حسینؑ اور ان کے ساتھیوں نے عبادت میں گذاری تاریخ بتلاتی ہے کہ رات بھر خیام حسینی سے دعاؤں کی آوازیں بلند رہیں۔ اور امام کے اعزہ و انصار عشق الٰہی کے سچے نمونے، محبت باری کے جیتے جاگتے پیکر، اپنے خدا کے ذکر میں مشغول رہے۔ ایک طرف تو عشق الٰہی کا مظاہرہ ہو رہا تھا اور دوسری طرف رات بھر تلواریں تیز کی جاتی رہیں۔ تیر زہر میں بجھائے جاتے رہے۔ نیزوں کی انیاں درست ہوتی رہیں اور رسولؐ کے گھرانے کو تین دن کا بھوکا پیاسا ذبح کر ڈالنے کے لیے جتنی تدابیر ممکن ہو سکتی تھیں وہ سب عمل میں لائی جاتی رہیں!

یہ ایک اور ضرب تھی جو یزیدیت پر عائد کی گئی اس لیے کہ دنیا نے یہ منظر دیکھ لیا کہ ایک

طرف اللہ والوں کی جماعت ہے اور دوسری طرف خونریز دنیا پرستوں کی ٹولی، ایک طرف وہ لوگ ہیں جو تلواروں کی چھاؤں میں سجدے کرنے کے عادی ہیں اور دوسری طرف وہ جماعت ہے جو سجدہ کرنے والوں کے مقابلہ میں شمشیر بکف ہے! حضرت نجم آفندی نے کیا خوب کہا ہے:

؎ کیا کفر یزیدی فوج میں ہے، کیا دین خدا کے پیاروں میں
سجدوں پر وہاں تلواریں ہیں، سجدے ہیں یہاں تلواروں میں

رات گذری اور صبح نمودار ہوئی، حسینؑ اور ان کے ساتھی نماز سے فارغ ہو کر میدان میں آئے، عمر سعد نے اپنے لشکر کی صفیں درست کیں، اور چاہا کہ جنگ کا آغاز کیا جائے کہ حسینؑ اونٹ پر سوار، قرآن ہاتھوں میں لیے لشکر عمر سعد کے سامنے تشریف لائے اور دشمن کو مخاطب کر کے ایک ایسی حق پرستانہ تقریر فرمائی جس سے دشمن کے کلیجے دہل گئے، آپ نے بتایا کہ میں تمہارے رسولؐ کا نواسا ہوں، میں نے تمہاری کوئی خطا نہیں کی ہے، تم نے ایک دو نہیں بائیس ہزار خط لکھ کے مجھے بلایا ہے تو میں آیا ہوں، میرا احترام خود رسولؐ نے واجب قرار دیا ہے اور اگر تم کو میری باتوں پر یقین نہیں ہے تو آؤ یہ قرآن موجود ہے جو میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ کر سکتا ہے، اگر تم قرآن پر ایمان رکھتے ہو تو اسے حَکَم بنالو، میں اس کا فیصلہ قبول کرنے کو تیار ہوں ——— لشکر یزید کے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا - آپ کی تقریر کے جواب میں بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا اور دشمن کی یہ خاموشی بجائے خود یہ واضح کر رہی تھی کہ اس کے پاس آپ کے دلائل کا کوئی جواب نہیں ہے، اسے آپ کی حقانیت کا پورے طور پر اعتراف ہے لیکن حرص دنیا نے آنکھوں پر ایسے پردے ڈال دیے ہیں کہ وہ اپنی غلط کاری کے احساس کے باوجود آپ کے خون سے ہاتھ رنگنے پر تیار ہے۔

یزیدیت پر یہ ایک اور ضرب تھی جو آپ نے عائد کی ——— آپ نے دنیا پر اور خود دشمن کے سپاہیوں پر یہ حقیقت روشن کر دی کہ آپ کے مخالفین صرف طمع دنیا

کی خاطر لڑ رہے ہیں اور اصول پسندی، ایمانداری، دیانت یا حق پرستی سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

جب آپ نے دیکھا کہ آپ کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا جاتا تو آپ واپس چلے آئے اور اپنے ایک ساتھی حضرت بُریر کو حکم دیا کہ وہ میدان میں جائیں اور دشمن کو حقیقت اور صداقت کی راہ دکھائیں۔ بُریر کوفہ کے رہنے والے تھے بہت بڑے عالم تھے اور کوفہ کی آبادی کا بڑا حصّہ اُن سے قرآن کی تعلیم حاصل کر چکا تھا۔ یزیدی لشکر میں ہزاروں آدمی ایسے موجود تھے جو آپ کے شاگرد رہ چکے تھے جو آپ کے علم و کمال، زہد، نیکی اور پرہیز گاری کے دل سے قائل تھے۔ چنانچہ جب آپ نے میدان میں آکے حسینؑ کی حقانیت اور ان کے مخالفین کی باطل پرستی کی قلعی کھولنا شروع کی تو دشمنوں کو شرم سے پسینہ آگیا۔ ان کے پاس بُریر کا کوئی جواب نہیں تھا وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ ان کو حسینؑ کے ساتھ ہی اس شخص کا بھی خون کرنا ہوگا جو ان کے شہر کا سب سے بڑا عالم ہے جو ان کا استاد ہے جس سے انھوں نے قرآن کی تعلیم حاصل کی ہے۔ جس کی نیکو کاری، عبادت، زہد اور کمال، خدا پرستی خود ان کے نزدیک مسلم ہے، اور جس کی دیانت یا حق پرستی میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی —— بریر کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا چنانچہ جب آپ نے اپنی تقریر ختم کی تو لشکر مخالف کے سر شرم سے جھکے ہوئے اور لب قطعاً خاموش تھے۔ یہ ایک فیصلہ کن ضرب تھی جو علمبردار امن نے یزیدیت پر عائد کی —— ایسی ضرب جس سے عمر سعد بوکھلا گیا، اس نے یہ سمجھ لیا کہ اب اگر حسینؑ اور اس کے ساتھیوں کو تقریر کا مزید موقع دیا گیا تو لشکر میں بغاوت ہو جائے گی، وہی سپاہی جو حسینؑ کے خون کے پیاسے ہیں ابن زیاد اور یزید کے خون کے پیاسے ہو جائیں گے چنانچہ جیسے ہی بریر واپس ہوئے ویسے ہی عمر سعد نے تیر باراں کا حکم دے دیا، اور جنگ کا آغاز کر دیا گیا!

اگر لشکر یزید کے پاس اپنی حقانیت کی کوئی دلیل ہوتی تو عمر سعد یا اس کے

ساتھی ضرور میدان میں آتے اور حسینؑ کے سامنے اپنے دلائل پیش کرتے، حسینؑ اور بُریر کی تقریروں کا جواب تیروں کی بارش سے دینا بجائے خود ان کی ضد، ہٹ دھرمی، دنیا داری اور بے دلیل خونریزی کا کھلا ہوا ثبوت ہے!

جنگ چھڑ گئی تو امام نے بھی اپنا انداز بدلا۔ ابھی تک آپ عدم تشدد کے اصولوں پر عمل کر رہے تھے۔ لیکن اہمسا کے اصولوں کا مطلب بزدلی یا ظالم کے مقابلہ میں سپر اندازی نہیں ہے۔ چنانچہ جب جنگ کا بازار گرم ہوگیا تو آپ نے ظلم کے مقابلہ میں بزدلانہ طریقہ پر ہتھیار ڈال دینے کے بجائے تلوار سنبھال لی اور اس قیامت کی جنگ لڑی جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں ملنا محال ہے۔ ہم اس جنگ کی تفصیل ایک علٰحدہ باب میں بیان کریں گے۔ یہاں صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ بہتّر آدمیوں کی اس مختصر سی جماعت کو پینتیس ہزار کا لشکر تقریباً دس گھنٹے کی جنگ میں اس وقت ختم کر سکا۔ جب خود اس لشکر کے کئی ہزار سپاہی مارے جا چکے تھے اور اتنے بڑے لشکر کو دن بھر میں کئی مرتبہ میدان سے فرار ہونا پڑا ——

اس یادگار زمانہ کی شجاعت کی مثال تاریخ میں ملنا محال ہے، تین دن کے بھوکے پیاسے بہتّر مجاہدوں کا ۳۵ ہزار آہن پوشوں کے مقابلہ میں دن بھر ڈٹے رہنا، ہزاروں دشمنوں کو فی النار کر دینا اور آخر دم تک اپنے عزم و ہمت میں فرق نہ آنے دینا، تاریخ شجاعت کا ایک بہت بڑا معجزہ ہے اور ہم اس بے نظر جنگ پر حسینؑ کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے مجبور ہیں!

حسینؑ نے اس بے نظیر جنگ کے ذریعہ دنیا کو یہ بتلا دیا کہ اہمسا کی کیا حدود ہیں اور جنگ کا موقع کب آجاتا ہے؟ حسینؑ نے حتی الامکان جنگ سے احتراز کیا اور امن کے حربوں سے مخالف کو زک دیتے رہے لیکن جب تیروں کا مینہہ برسنے لگا تو اس وقت چپ رہنے یا خاموشی کے ساتھ اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دینے کا مطلب بزدلی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا، یہ وہ منزل تھی جہاں حسینؑ کو اپنی شجاعت اور بے جگری ظاہر کرنے کے علاوہ باطل کی قوتوں

کو کچل دینے کے لیے تلوار کا سہارا لینا ضروری تھا، حق پرست ایک خاص وقت تک صبر و برداشت سے کام لیتے ہیں لیکن جب یہ یقین ہو جائے کہ فریق مخالف کا ضمیر مردہ ہو چکا ہے، اس کے دل میں ایمان کی روشنی پیدا ہونے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا ہے، اور وہ باطل کے رنگ میں اس حد تک ڈوب چکا ہے کہ اب اس کے راہِ راست پر آنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تو انسانیت کے جسم پر اُبھرے ہوئے پھوڑے کا اپریشن کرنے کے لیے تلوار اٹھانا لازمی ہو جاتا ہے۔ ان کے اس اقدام کو تشدد یا جنگ آزمائی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، جس طرح ڈاکٹر ایک زہریلے پھوڑے کا اپریشن کر دیتے ہیں۔ کسی عضو میں زہر پھیل جانے پر بقیہ جسم کو محفوظ رکھنے کے لیے اس عضو کو کاٹ دیتے ہیں۔ اور ان کے اس فعل کو تشدد سے تعبیر نہیں کیا جاتا بلکہ اسے عین اصلاح تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح حق کے پرستار جب اصلاح کی کوئی امید نہیں دیکھتے تو انسانی معاشرہ کو تاریک دل اور مردہ ضمیر باطل پرستوں کے فساد سے محفوظ رکھنے کی خاطر ان کی سرکوبی کے لیے تلوار کا سہارا لیتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو ظلم کی طاقتوں کی ہمت افزائی ہو گی اور عام انسانوں میں ظالموں کا مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا نہیں ہو سکے گی۔ چنانچہ حسینؑ نے وہی کیا جو ان کا فرض تھا۔ انھوں نے بزدلانہ انداز میں لشکر کے سامنے ہتھیار ڈال دینے اور باطل کی مادّی شان و شوکت سے مرعوب ہو جانے سے انکار کر دیا اور مردانہ وار میدان میں آ گئے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ شہید ہو گئے لیکن اپنی شہادت سے ہمیں یہ لافانی درس دے گئے کہ ظلم کی طاقتوں کے مقابلہ میں ہتھیار ڈال دینا بزدلی، کم ہمتی اور غلامانہ ذہنیت کا مظہر ہے۔ شرافت اور انسانیت کا اقتضیٰ یہی ہے کہ انسان مر جائے لیکن ظالم کے ہاتھوں میں ہاتھ نہ دے، باطل کی غلامی قبول نہ کرے اور کتے کی زندگی کے مقابلہ میں شیر کی موت کو ترجیح دیتے ہوئے شہیدوں کی جاودانی صف میں ہمیشہ کے لیے اپنا نام شامل کر جائے!

حسینؑ اور ان کے ساتھی شہید کر دیے گئے، ان کی شہادت کے بعد ہی عمر سعد نے حکم دیا کہ شہیدوں کے سر کاٹ لیے جائیں اور ان کی لاشیں گھوڑوں کی ٹاپوں سے

روند ڈالی جائیں!

لاشوں کے سر کاٹنا اور ان پر گھوڑے دوڑانا ایک ایسا بھیانک ظلم ہے۔ جس پر انسانیت کی روح کانپ اٹھتی ہے۔ اس سے یزیدی لشکر کی درندگی اور بربریت کا پورا ثبوت مل جاتا ہے ایسا ثبوت جس کے بعد انسانی ضمیر کی عدالتِ عالیہ یزید کو سخت ترین اور ناقابلِ عفو مجرمین کی صف میں کھڑا کر دینے پر مجبور ہے!

یہاں سے پھر حسینیؑ جنگ کا انداز بدل جاتا ہے!

لاشوں کی پامالی کے بعد یزیدی لشکر خیامِ حسینیؑ پر حملہ کرتا ہے۔ خیمے جلا دیے جاتے ہیں، سیّدانیوں کا سامان لوٹ لیا جاتا ہے۔ اور حسینؑ کے گھر کی عورتیں اور بچیاں گرفتار کر لی جاتی ہیں!

حق پرستوں کے قافلہ کا کمانڈر تبدیل ہو جاتا ہے، پہلے کمانڈ حسینؑ کے ہاتھوں میں تھی، اب اُن کی بہن زینبؑ کے ہاتھوں میں ہے، زینبؑ ایک ایسے "لشکر" کی قیادت کر رہی ہیں جس میں ایک بیمار لڑکا اور چند عورتیں اور بچے شریک ہیں سب گرفتار، اسیر، مشکیں کسی ہوئی، بازو اور گردنیں بندھی ہوئی! —— لیکن عزیزوں کی موت، خیام کی لوٹ اور اسیری کے باوجود ان کے تیور وہی ہیں جو حسینؑ کے تھے، عزم وہی ہے، جو حسینؑ کا تھا، ہمت وہی ہے جو حسینؑ میں تھی، حق پرستی کا ولولہ وہی ہے جو حسینؑ میں تھا —— سامنے بھائیوں، بیٹوں اور بھتیجوں کے سر ہیں، گرد عمر سعد کا لشکر ہے، پیٹھ پر تازیانے پڑ رہے ہیں، بازو اور گردنیں رسیوں سے زخمی ہیں، لیکن جیسے ہی یہ لٹا ہوا قافلہ کوفہ کے بازار میں داخل ہوتا ہے، ویسے ہی باطل کے قلعہ پر گولہ باری شروع کر دی جاتی ہے، ہزاروں تماشائیوں کے ہجوم میں زینبؑ اور ام کلثومؑ ایسی باطل شکن تقریریں کرتی ہیں کہ خود دشمن کا کلیجہ منہ کو آجاتا ہے۔ سننے والوں کی آنکھیں نمناک ہو جاتی ہیں اور کوفیوں کی گردنیں شرم سے جھک جاتی ہیں، باطل حق کے سامنے سربسجود ہو جاتا ہے اور وہی لوگ جو قتلِ حسینؑ کی عید منا رہے

تھے ندامت اور غم کی بدلیوں میں روپوش ہو جاتے ہیں۔ زینبؑ و ام کلثومؑ کی تقریریں یزیدیت پر ایک کاری ضرب تھیں، ایسی ضرب جس سے کوفہ لرز اُٹھا اور خود دشمنوں کا قلعہ حسینؑ کی حقانیت کے سامنے زمین بوس ہو گیا۔

قیدیوں کا قافلہ دربار ابن زیاد میں داخل ہوا، شہیدوں کے سر یزید کے گورنر کے دربار میں بطور تحفہ پیش کیے گئے، ابن زیاد خوشی سے پھولا نہیں سماتا تھا۔ لیکن اس کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی، اسے یقین تھا کہ اب حق پرستوں کی ہمت ٹوٹ چکی ہو گی۔ ظلم کی تند ہواؤں نے حق کا چراغ گل کر دیا ہو گا، طاقت و جبروت کے مظاہروں نے آل رسولؐ کی ہمت توڑ دی ہو گی لیکن قیدی، مظلوم اور دکھیاری زینبؑ نے جس کی نگاہوں کے سامنے اس کے بیٹوں، بھائیوں اور بھتیجوں کے کٹے ہوئے سر موجود تھے، جس کے گرد قاتلوں اور خونیوں پر مشتمل ہزاروں سپاہی موجود تھے۔ جس کے بازو رسیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ دشمن کے بھرے دربار میں حق کی صدا اس شان سے بلند کی، ابن زیاد کو ایسے دنداں شکن جواب دیے اور ہمت اور جرأت کا ایسا قیامت خیز مظاہرہ کیا کہ ایوانِ حکومت کانپ اُٹھا، ابن زیاد سرنگوں ہو گیا اور خود درباریوں میں ایسا ہیجان پیدا ہوا کہ تیسرے ہی روز ابن زیاد نے یہ سمجھتے ہوئے کہ کوفہ میں زینبؑ کی موجودگی حسینؑ کے حق میں عام بغاوت کا سبب بن جائے گی، قیدیوں کے اس قافلہ کو دمشق روانہ کر دیا۔

دمشق کے بازاروں میں یزید کے دربار میں اور جامع دمشق میں زینبؑ ام کلثومؑ اور علی ابن الحسینؑ نے جو تقریریں کیں ان سے یزیدیت کا قلعہ پورے طور پر پاش پاش ہو گیا حسینؑ کا گھرانا ایک سال تک دمشق کے قید خانہ میں اسیر رہا۔ لیکن اس قید کے باوجود اس نے حق کی خاطر اپنا جہاد جاری رکھا۔ ایسا زبردست جہاد جس نے دشمنوں کے سر ہی نہیں ان کے دل بھی اپنے سامنے جھکوا لیے اور محض ایک سال

کی مختصر سی مدّت میں خود دشمن کا دار الحکومت حسینؑ کی حقانیت کے اعتراف کے نعروں سے گونجنے لگا۔ یزید کو جسے اپنی کامیابی کا بے حد گھمنڈ تھا اب حقیقتِ حال کا علم ہوا، اس نے دیکھا کہ خود اس کے شیدائی اس کے خلاف ہوتے جا رہے ہیں، اس کی باطل پرستی عوام پر آشکار ہو چکی ہے، حسینؑ کی حقانیت کا پرچم خود دمشق میں لہرا رہا ہے اور وہی حسینؑ جن کو کربلا کے بن میں بھوکا پیاسا شہید کر کے اس نے فتح کے شادیانے بجائے تھے آج اس درجہ طاقتور بن چکے ہیں کہ بنو امیہ کا سارا جاہ و جلال، حکومت کی ساری طاقت، لشکروں کا سارا رعب داب، اور خزانوں کی ساری چمک دمک ان کے مقابلہ میں ہیچ نظر آ رہی ہے۔ وہ سمجھا تھا کہ حسینؑ کے قتل پر جنگ ختم ہو جائے گی اور دنیا اس کی فتح و ظفر کا اعتراف کرے گی لیکن حسینؑ کے اہل بیت نے مجبور اور بے بس قیدی عورتوں نے جنگ جاری رکھ کے اموی سلطنت کا تختہ الٹ دیا۔ جنگ کا انداز ضرور ضرور بدل گیا تھا، تلواروں کی جھنکار ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کی کھڑکھڑاہٹ میں تبدیل ہو گئی تھی، حق کے حربے شجاعت سے بل کھاتے ہوئے مردانہ بازوؤں کے بجائے عورتوں کے کمزور اور رسن بستہ بازوؤں نے سنبھال لیے تھے۔ جنگ کا میدان کربلا سے منتقل ہو کر دمشق پہنچ گیا تھا، خیام کی جگہ قید خانے نے لے لی تھی اور لوہے کی تلواروں کے بجائے لسانِ حق سے مجاہدہ جاری تھا۔ تیر و تبر کی جگہ اہمسا نے سنبھال لی تھی، انداز بدل گیا تھا لیکن جنگ جاری تھی اور آخر اس جنگ کا نتیجہ یہ نکلا کہ یزید کو شکست ہوئی دائمی اور فیصلہ کن شکست ——— ایسی شکست جس کا خمیازہ وہ آج تک ان لعنتوں کی شکل میں بھگت رہا ہے جو ہر حق پسند انسان خواہ وہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتا ہو اس پر بھیجا کرتا ہے۔

حسینؑ نے حق پرستوں کی جنگ کا جو انداز ہمارے سامنے پیش کیا ہے وہ ہمارے لیے ایک عظیم مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ حسینؑ نے بتلایا کہ قیامِ حق

کے لیے لڑو اور اس وقت تک لڑتے رہو جب تک کہ تمہیں قطعی اور فیصلہ کن فتح نہ حاصل ہو جائے، کسی حالت میں ظالموں کے سامنے ہتھیار نہ ڈالو، جب تک بازوؤں میں سکت رہے تب تک تلوار سے جنگ کرو اور جب تلوار اٹھانے کی طاقت باقی نہ رہے تو اہمسا کا حربہ سنبھال لو، جنگ جاری رکھو، چاہے اس کا انداز کچھ ہی ہو، باطل کے سامنے سر نہ جھکاؤ، ظالم کا مقابلہ کرو، حق کے لیے ہر حالت میں آواز بلند کرتے رہو، قلت تعداد سے مایوس نہ ہو، ظاہری اسباب کی کمی سے ہراساں نہ ہو، اپنی ہمت بحال رکھو، جرأت قائم رکھو، اولوالعزمی سے کام لو اور باطل کے مقابلہ میں جنگ جاری رکھو ——— اگر تم نے اس جنگ میں استقلال کا مظاہرہ کیا اور حق کی خاطر انتہائی صبر آزما اور پُر آشوب حالت میں بھی اپنے موقف پر قائم رہے، تو فتح تمہاری ہوگی اس لیے کہ فتح ہمیشہ حق ہی کی ہوا کرتی ہے، فتح حق کا مقسوم ہے اور شکست باطل کا نصیب!

حق آگاہ خواتین

دنیا میں حق اور باطل کے جتنے محاذ قائم ہوئے ان میں حق پرستوں کے مورچہ کی کمانڈ ہمیشہ مردوں کے ہاتھوں میں رہی اور صنف نازک ان معرکوں سے ہمیشہ دور رہی۔ یہ صحیح ہے کہ تاریخ نے ہمیں بہت سی ایسی عورتیں عطا کی ہیں جنھوں نے اپنے تقدس، پاکیزگی، عبادت گذاری اور روحانیت کی قابل تقلید مثالیں چھوڑی ہیں لیکن ان کے اخلاقی اور روحانی کمالات صرف ان کی ذات تک محدود رہے، اصلاح عالم کے مجاہدہ میں ان کا کوئی حصہ نہیں رہا۔ لیکن کربلا کے میدان میں ہمیں وہ حق آگاہ اور جرأت مند خواتین ملتی ہیں جنھوں نے نہ صرف یہ کہ حق و باطل کے اس مجاہدۂ کبریٰ میں زبردست حصہ لے کر صنفِ نسواں کا سر اونچا کر دیا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ انھیں خواتین نے اس جہادِ حق کو کامیابی و کامرانی کی منزلوں سے ہمکنار کیا جس کے آغاز کا شرف حسینؑ کو اور اختتام کی عزت زینبؑ کو حاصل ہے!

تاریخ کے طالب علم اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ اگر نواسۂ رسولؐ کے گھر کی عورتیں اس معرکہ میں شریک نہ ہوتیں تو حسینؑ کی دائمی فتح، گمنامی کی ابدی ظلمتوں میں کھو کے ہمیشہ کے لیے نگاہوں سے معدوم ہو جاتی۔ حسینؑ کی شہادت کا کسی کو علم تک نہ ہوتا اور تاریخ صرف یہ کہتی کہ "عراق کی سرزمین پر ترک کافروں نے حملہ کیا تھا۔ جنھیں یزید کی فوجوں نے کربلا میں شکست دے کر مملکت اسلامی کی حفاظت کا فریضہ انجام دیا تھا" ——— یزید نے اس جنگ کے سلسلہ میں

ساری دنیائے اسلام میں یہی مشہور کر رکھا تھا، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے معرکۂ کربلا کے اختتام پر خوشیاں منائی تھیں، شہر سجائے گئے تھے، لوگ سرخ لباس پہنے ایک دوسرے سے عید مل رہے تھے، اور "ترک کافروں" پر "مسلمانوں کی کامیابی" کی ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے، لیکن زینبؑ ام کلثومؑ فاطمہ کبریٰؑ اور دوسری رسول زادیوں نے اس جھوٹے پروپیگنڈا کی قلعی کھول دی، ان کی زلزلہ افگن تقریروں نے مسلمانوں کے دل ہلا دیے، فریب کے پردے چاک کر دیئے گئے اور دنیا پر یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی۔ کہ کربلا میں یزید کی فوجوں نے ترک کافروں پر فتح نہیں پائی بلکہ خانوادۂ رسالت کو پامال کیا ہے، پیغمبر اسلام کے جگر گوشوں کو ذبح کیا ہے، حق کے نام لیواؤں کا خون بہایا ہے، علیؑ و فاطمہؑ کی آل کا خون بہایا ہے، اور اسلام کے ان جیتے جاگتے نمونوں کو بے دردی سے تہ تیغ کیا ہے، جن کی حقانیت، نورانیت اور روحانیت پر اسلام کو بجا طور پر فخر ہو سکتا ہے۔

ابن زیاد اور یزید کے بھرے درباروں میں سیدۂ زینبؑ نے جو باطل شکن تقریریں کیں ان سے یزید اور اس کے نائب ابن زیاد کے مظالم عوام کی نگاہوں کے سامنے آگئے، حسینؑ کی حقانیت عالم پر آشکار ہو گئی اور دنیا نے ان اعلیٰ و برتر مقاصد کو اچھی طرح سے سمجھ لیا جن کی خاطر خانوادہ رسالت نے کربلا کے بن میں قربانیاں پیش کی تھیں!

حسینؑ کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے حق کی خاطر جنگ چھیڑی اور بالآخر حق کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ گئے ——— حسینؑ کی جنگ ابھی نامکمل تھی، زینبؑ نے رسن بستہ بازوؤں سے اس جنگ کی تکمیل کی، اسے فتح کی منزل سے ہمکنار کیا اور اپنے خاموش مجاہدہ سے حق کو زندگیٔ جاوید عطا کر گئیں!

حسینؑ کے گھرانے کی خواتین اپنی حق پرستی، دلیری اور جذبۂ فدائیت

ہیں اپنی آپ مثال تھیں، ان عورتوں کی دلیری کی کیا تعریف ہو سکتی ہے۔ جن کے سامنے ان کا بھرا کنبہ ذبح کر ڈالا گیا، ان کے بچے مار ڈالے گئے، باپ اور بھائی شہید کر دیے گئے، خیمے جلا دیے گئے، سروں سے چادریں چھین لی گئیں، کانوں سے دُر اتار لیے گئے، بازوؤں اور گلوں کو رسیوں سے جکڑ دیا گیا، جسم کوڑوں سے لہولہان کر دیے گئے، شتر ان برہنہ پر بٹھا کے شہر بشہر دیار بدیار تشہیر کی گئی، ان کی نگاہوں کے سامنے بھرے درباریوں میں ان کے عزیزوں کے کٹے ہوئے سر بطور تحفہ پیش کیے گئے، ان کو باندیوں کی صورت میں بادشاہوں کے سامنے حاضر کیا گیا، لیکن باایں ہمہ مصائب ان کی تیوریوں پر بل نہیں آئے، ان کے عزم میں کوئی کمی نہیں ہوئی، ان کی ہمت و جرأت میں شکست کا کوئی اثر پیدا نہیں ہوا اور وہ پوری بیباکی کے ساتھ، پوری نڈری کے ساتھ دشمن کے بھرے درباروں میں حق کا آوازہ بلند کرتی رہیں، دشمن کی برہنہ تلواروں کے سائے میں حقانیت کا پرچم اپنے طاقت ور بازوؤں میں سنبھالے رہیں اور اپنے ذاتی مصائب کا لحاظ کیے بغیر ان صبر آزما حالات میں بھی حق کی خاطر رزم آرا رہیں، جن میں پتھروں کا کلیجہ پانی اور شیروں کا جگر شق ہو جانا آسان ہے!

میں اس مقام پر کربلا کی چند خواتین کا مختصراً تذکرہ کرنا چاہتا ہوں تاکہ ان شیر دل عورتوں کے حق پرستانہ کردار کی ایک جھلک پڑھنے والوں کی نگاہوں کے سامنے آجائے!

حبیب بن مظاہر اور زہیر بن قین نے کربلا میں جس فدائیت کا مظاہرہ کیا ہے اس کا ذکر تاریخ کربلا کے سینہ پر ہمیشہ سنہرے حروف میں زندہ رہے گا لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان دونوں مجاہدین حق کو ان کی بیویوں نے اس پر آمادہ کیا تھا کہ وہ حسینؑ کی خدمت میں جائیں۔ اور حق پر اپنی جانیں نچھاور کریں، حبیب اور زہیر کو حسینؑ نے قاصد بھیجے تھے جن

میں ان کو مرنے کی دعوت دی گئی تھی، یہ خط دیکھ کر ان کے دل کانپ اُٹھا تھے۔ لیکن یہ اُن حق آگاہ خواتین کا کمال ایمان تھا کہ انھوں نے اپنے شوہروں کو حق پر مٹنے کی ترغیب دی اور ان کو اس پر مجبور کیا کہ وہ اپنی بیویوں کی بیوگی بچوں کی یتیمی اور گھروں کی تباہی کا خیال کیے بغیر حق پر قربان ہو جائیں، سراپا ایثار زہیر بن قین کی زوجہ کا نام دیلم تھا۔

عاشور کی رات کو ہر بی بی نے اپنے بچوں، بھائیوں اور شوہر کو یہ تلقین کی کہ کل جب معرکہ کارزار گرم ہو تو تم سب سے پہلے حق اور حسینؑ پر قربان ہو کر مجھے پیش خدا سرخرو ہونے کا موقعہ دینا، کسی خیمہ میں اُم لیلیٰ تھیں جو اپنے اٹھارہ سال کے کڑیل جوان علی اکبرؑ کو یہ ہدایت کر رہی تھیں کہ "بیٹا! کل یوم امتحان ہے میری عزت تیرے ہاتھ ہے۔ فرزند رسول پر جان قربان کر کے مجھے روز قیامت رسولؐ اللہ کے سامنے سربلند کر دینا"۔ کسی خیمہ میں ام فروہ اپنے جگر گوشوں قاسمؑ اور عبداللہؑ کو یہ سمجھا رہی تھیں کہ "جگر کے ٹکڑو! کل حسینؑ اور ان کے بچوں پر کڑا وقت ہے۔ علی اکبرؑ سے پہلے حسینؑ پر اپنی جانیں نچھاور کر دینا تاکہ مجھے ام لیلیٰ سے ندامت نہ ہونے پائے، تمہارے باپ کو حسینؑ سے بڑی محبت تھی، کل چچا پر مسکراتے ہوئے قربان ہو جانا اور دنیا کو دکھا دینا کہ حسنؑ کی آل میں بھی حسینؑ کی وہی محبت جلوہ گر ہے جو خود حسنؑ میں تھی۔ میرے بچو! کل دیکھنے والے یہ دیکھ لیں کہ اگر آج حسنؑ زندہ ہوتے تو وہ بھی اسی شان سے حسینؑ پر فدا ہوتے جس شان سے تم چچا پر قربان ہو رہے ہو!" کہیں زینبؑ اپنے ننھے ننھے بچوں کو کلیجہ سے چمٹائے یہ درس دے رہی تھیں کہ "دیکھو عونؑ و محمدؑ! کل حسنؑ اور حسینؑ کی اولادیں حق پر سر دینے میں ایک دوسرے پر سبقت کریں گی، تم علمبردار لشکر رسولؐ جعفر طیار کے کرتے اور حیدرؑ صفدر کے نواسے ہو، تمہاری رگوں میں تو دو ھیال اور ننھیال دونوں جانب سے حق پرستی کا خون آیا ہے۔ کل حسنؑ اور حسینؑ کی اولادوں

سے پہلے دین پر قربان ہو کر جعفرؑ کی روح کو شاد کر دینا۔ میرے خزانہ کے موتی ننھے ننھے سہی، لیکن میری دلی تمنا ہے کہ یہ ننھے ننھے موتی جب خاتم شہادت میں جلوہ فگن ہوں تو ان کی ضَو سے جواہرات شرمندہ ہو جائیں تم آلِ رسولؐ میں سب سے پہلے شہید ہونا تاکہ ثانی زہراؑ کا سر اونچا ہو جائے اور جب میں قیامت کے دن اپنی ماں فاطمہ زہراؑ کے سامنے جاؤں تو ان سے فخر کے ساتھ یہ عرض کر سکوں کہ مادر گرامی! آپ کے لال پر سب سے پہلے نثار ہونے کا شرف جسے نصیب ہوا وہ اسی دکھیاری کے جگر بند تھے۔" کہیں زوجہ مسلم اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں سے یہ ارشاد کر رہی تھیں کہ "بیٹا، تمہارا باپ حسینیؑ لشکر کا ہراول اور معرکہ کرب و بلا کا پہلا شہید تھا، اس کی سنت کو تازہ رکھ کے، اس کی مظلوم روح کو شاد کر دینا۔ علیؑ اور جعفرؑ کی آل مرنے پر تیار رہے لیکن تم ان سب سے پہلے ماموں پر قربان ہو کر دنیا کو دکھلا دینا کہ جس طرح ہمارا بے کس و بے وطن باپ سب سے پہلے کوفہ میں حسینؑ پر قربان ہوا اسی طرح ہم یتیمانِ مسلم کربلا میں سب سے پہلے حسینؑ پر قربان ہو کر اپنے باپ کی روایت کو زندہ کر رہے ہیں!" —— غرض یہ کہ ہر خیمہ میں یہی گفتگو تھی، ہر بی بی اپنے وارث کو موت پر آمادہ کر رہی تھی۔ اور یہ انھیں بی بیوں کی جرأت و حق پرستی کا کمال تھا کہ دوسرے دن لشکر حسینی کے چھوٹے چھوٹے بچوں نے بھی اس جذبۂ فدائیت کا مظاہرہ کیا جس کی تاریخ عالم میں مثال ملنا محال ہے!

دن نکلا، جنگ چھڑی، حُرؑ اور بُریرؑ نے جامِ شہادت نوش کیا، اچانک ایک خاتون نے اپنے نوجوان بیٹے کو خیمہ میں طلب کیا اور بولی "وہبؑ[1]! کیا

---

[1] معتبر روایت میں وارد ہوا ہے کہ حضرت وہب کلبی جب ابن زیاد کے دونوں غلاموں یسار اور سالم کو قتل کر چکے تو دشمن کے سپاہیوں پر فتح پانے پر جوش شجاعت میں اضافہ ہوا تو یہ

دیکھ رہا ہے؟ کس بات کا منتظر ہے؟ خدا کی قسم اگر ابھی تو نے فرزندِ رسولؐ پر اپنی جان قربان نہ کر دی تو میں قیامت تک دودھ نہیں بخشوں گی! وہب نے ماں کا جملہ سنا، جوان تھا۔ ابھی ابھی شادی کر کے پلٹا تھا، ہاتھوں سے مہندی کا رنگ بھی نہیں مٹنے پایا تھا کہ موت نے پکار لیا، عروس شرمائی لجائی خیمہ کے ایک گوشہ میں موجود تھی، دولہا نے دلہن پر ایک حسرت آمیز نگاہ ڈالی اور بولا، اماں! آپ ناراض کیوں ہوتی ہیں، مولا نے ابھی تک اذن جہاد نہیں دیا تھا اس لیے میں منتظر موت تھا، آپ کا حکم ہے تو ابھی جاتا ہوں اور فرزند رسولؐ پر جان نچھاور کرتا ہوں!" یہ کہا اور خیمہ کی جانب مڑا۔ دروازہ تک پہنچا تھا کہ عروس نے آگے دامن تھام لیا، ماں نے بھی یہ منظر دیکھا اور تڑپ کے بولی "وہب! اگر تو نے اس کی بات سُنی اور فرزندِ زہراؑ سے اپنی جان عزیز کی تو یاد رکھ کہ میں تجھے کبھی معاف نہیں کروں گی!"

رجز پڑھ رہے تھے۔

"اگر مجھے نہ پہچانتے ہو تو پہچان لو! میں قبیلہ کلب کا سپوت ہوں میرے حسب نسب کے لیے اتنا کافی ہے کہ خاندان علیم میں میرا گھرانہ ہے، میں ایک سخت مزاج، درشت خو انسان ہوں اور مصیبت کے وقت پست ہمت نہیں ہوتا۔" (پھر اپنی زوجہ سے مخاطب ہو کر کہا) اے رفیقۂ حیات! میں ذمہ دارانہ حیثیت سے کہتا ہوں کہ میں ان میں بڑھ بڑھ کر نیزے لگاؤں گا اور تلواریں ماروں گا اس طرح کی شمشیر زنی جو خدا پر ایمان رکھنے والے جوان ہمت کے شایان ہے۔"

ان اشعار نے زوجۂ وہب کے صبر و ضبط کے لیے "برق خرمن" کا کام کیا، وہ بے تحاشا ایک گرز ہاتھ میں لے کر آگئی اور پکار کر کہنے لگی "میرے ماں باپ دونوں تم پر نثار ہوں اولاد رسولؐ کی نصرت میں کوتاہی نہ ہونے پائے۔"

غیور شوہر فوراً زوجہ کے پاس آیا اور چاہا کہ اسے خیمہ کی طرف پہنچا دے مگر بہادر خاتون نے اپنا دامن

حق پرست بہو کے لیے یہ الفاظ بہت تھے، ہزاروں نشتروں کے برابر تھے، آنکھوں میں آنسو جھلک آئے، دست ادب باندھ کے آہستہ سے بولی۔ "امّی! میری کیا مجال کہ میں ان کو مرنے سے روکوں! میں تو ان سے صرف یہ وعدہ لینا چاہتی ہوں کہ جنت میں اکیلے نہیں جائیں گے بلکہ مجھے بھی ساتھ لے کے داخل فردوس ہوں گے! ساس نے بہو کی بات سنی اور مسکرائی، سمجھ گئی کہ بہو کے دل میں بھی حقانیت اور ایمان کے ہیرے جگمگا رہے ہیں "وہب! دلہن کا مطالبہ برحق ہے، ابھی تو اس کے جسم سے سہاگ کی خوشبو بھی نہیں مٹنے پائی ہے اور تو جدا ہو رہا ہے، وعدہ کرلے

عبداللہؑ کے ہاتھ سے چھڑا لیا اور کہنے لگی "میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں جب تک میں بھی تمہارے ساتھ قتل نہ ہوں۔" امام حسین علیہ السلام نے جو یہ دیکھا آواز دی "خدا تم دونوں کو جزائے خیر دے، اے مومنہ عورتوں کے پاس جا اور ان کے ساتھ بیٹھی رہ کیونکہ عورتوں پر سے جہاد ساقط ہے۔" ایمان اور اطاعت امام کا احساس تھا جو بے پناہ جذبۂ محبت اور وجدان قربانی پر غالب آیا اور یہ محترمہ خواتین کے پاس خیمہ میں واپس چلی گئی۔ جب شوہر شہید ہو چکا تو جہاد کے لیے نہیں کیونکہ امام ممانعت فرما چکے تھے صرف اس لیے کہ اپنے شوہر کی لاش سے وداعی ملاقات کرے، میدان میں آئی اور شوہر کے سرہانے بیٹھ گئی اس کے چہرے سے گرد و غبار صاف کرتی جاتی اور کہتی جاتی تھی کہ تمہیں جنت مبارک ہو، بہشت کی سیر کرنا مبارک ہو مگر دشمن کے ظلم و تشدد کی انتہا یہ تھی کہ شمر نے اپنے غلام کو جس کا نام رستم تھا آواز دی کہ اس عورت کا کام تمام کر دو، وہ بڑھا اور اس نے ستم رسیدہ اور دل خستہ خاتون کے سر پر ایسا گرز مارا کہ وہ اسی جگہ ختم ہو گئی۔ (طبری، جلد ۶ صـ ۲۵۱)

اس طرح کربلا کے رنگین مرقع میں ایک قابل احترام خاتون کا مقدس خون بھی شامل ہو گیا۔ ایسا ہی ایک واقعہ کربلا کی ایک ماں بحریہ بنت سعود انصاریہ کا ہے۔ یہ اپنے شوہر جنادہ بن کعب خزرجی کے ساتھ واقعہ کربلا میں موجود تھیں، جب جنادہ درجۂ شہادت پر فائز ہو چکے تو اس بیوہ نے اپنے یتیم بچہ عمرو بن جنادہ کو جس کا سن تو یا دس برس کا تھا ہدایت کی کہ وہ باہر نکلے اور امام حسین علیہ السلام کی

اور ایمان پر جان قربان کر کے اس کے لیے اور میرے لیے جنت کا سہارا بن جا!" وہب نے ماں کا حکم سنا، دامن کا ایک ٹکڑا پھاڑ کے دلہن کے حوالے کیا اور بولا "حسینؑ گواہ ہیں کہ اپنے وعدہ پر قائم رہوں گا اور بغیر تیرے ہرگز جنت میں نہیں جاؤں گا!" نوعروس نے دولہا کی محبت کی نشانی پیار کے ہاتھوں لی اور مسکراتے ہوئے وہب کو مرنے کی اجازت دے دی، چند دن کا بیاہا دولہا میدان میں پہنچا، لڑا، دونوں شانے قلم ہو گئے اور آخر سر تن سے جدا کر دیا گیا۔ ایک ملعون نے کٹا ہوا سر خیام حسینیؑ کی جانب پھینک دیا، اس سر کو دیکھ کے محبت مادری جوش میں آگئی، ماں خیمہ سے نکل آئی اپنے لال کا سر اٹھا کے کلیجہ سے لگایا منہ پر منہ ملا اور پھر کچھ سوچ کے اسے لشکر کی جانب پھینک دیا اور بولی "ہم جو چیز راہ خدا میں دیتے ہیں اسے پھر واپس نہیں لیتے، لے

نصرت میں جنگ کرے۔ بچہ خدمت امام علیہ السلام میں آیا اور اذنِ جہاد طلب کیا۔ حضرت نے اجازت دینے سے انکار کیا، بچہ نے پھر رخصت طلب کی۔ حضرت نے اپنے اصحاب کی طرف رُخ کر کے فرمایا، ابھی تو اس کا باپ معرکۂ جنگ میں شہید ہو چکا ہے اب بھلا اس کی ماں کے دل پر کیا گزرے گی جو یہ بھی جا کر شہید ہو جائے، بچہ نے کہا مولا! میری ماں ہی نے تو مجھے بھیجا ہے، مجھے یہ جنگ کا لباس پہنایا ہے۔ امام مجبور ہوئے اور اجازت دی۔ بچہ میدان میں آیا اور دادِ شجاعت دے کر شہید ہوا، سخت دل اور بے رحم فوج نے بچہ کا سر کاٹ کر فوج حسینی کی طرف پھینک دیا حوصلہ مند ماں نے بچہ کا سر اٹھا لیا اور کہا شاباش بیٹا شاباش! تو نے میرا دل خوش کر دیا اور میری آنکھوں میں ٹھنڈک ڈال دی، پھر اس نے سر کو اٹھا کر دشمن کی طرف پھینک دیا اور کہا یہ فرزند فاطمہؑ کا صدقہ ہے، صدقہ دے کر واپس نہیں لیا کرتے۔ خود بھی ایک گرز آہنی لے کر دشمن پر حملہ کر دیا۔ امام نے جو یہ دیکھا اسے گوارا نہ کیا اور اس عورت کو خیمہ کی طرف واپس فرما دیا۔ طبقۂ نسواں کی اس ایثار و قربانی کی نظیر دنیا کی تاریخ میں بے مثال ہے اور ہمیشہ بے مثال رہے گی۔

جاؤ دہب کا سرمایہ اللہ کی راہ میں قربان کیا جا چکا!

مسلم بن عوسجہ شہید ہوئے، مولا جیسے ہی ان کی لاش میدان سے لائے ویسے ہی آپ نے دیکھا کہ ایک چھوٹا سا بچہ کمر میں تلوار لگائے ایک خیمہ سے نکل کر میدان کی جانب جا رہا ہے، آپ نے کسی سے پوچھا، "یہ بچہ کس کا ہے؟" جواب ملا "مسلم بن عوسجہ کا" فرمایا "اسے بلا لاؤ۔" بچہ حاضر خدمت ہوا تو آپ نے فرمایا "تمہاری ماں کے لیے تمہارے باپ کی شہادت کافی ہے، تم بھی شہید ہو گئے تو تمہاری ماں کا ہر سہارا ٹوٹ جائے گا۔ اس لیے تم خیمہ میں واپس چلے جاؤ اور اپنی ماں کا کلیجہ ٹھنڈا رکھو۔ بچہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کے عرض کی "مولا! یہ تلوار میری ماں نے ہی میری کمر میں باندھی ہے اور انھیں کا حکم ہے کہ میں اپنے باپ کے ساتھ حق پر نچھاور ہو جاؤں۔ مجھے جلدی مرنے کی اجازت دے دیجیے، مولا، اس لیے کہ میری ماں کی یہ دلی خواہش ہے کہ میں بھی اپنے باپ کے مانند حق پر فدا ہو جاؤں!"

انصار حسینؑ کی خواتین کے جوش حق پرستی کی محض یہ دو مثالیں میرا مقصد واضح کرنے کے لیے کافی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے، کہ ان عورتوں نے ایسی فداکاری کے مظاہرے کیے ہیں جن پر نسل انسانی قیامت تک ناز کرتی رہے گی، ان عورتوں کا حسینؑ سے کوئی رشتہ نہیں تھا، کوئی عزیزداری نہیں تھی۔ صرف ایک ایمانی رشتہ تھا جو ان کو حسینؑ سے وابستہ کیے ہوئے تھا اور اسی رشتہ کی خاطر انھوں نے اپنے شوہروں، بھائیوں اور بچوں کو حسینؑ اور حق پر قربان کر دیا۔ شہادت کے بعد اسیری

کے مصائب برداشت کیے لیکن کوئی تاریخ یہ نہیں بتلاتی کہ ان میں سے کسی عورت نے کسی موقع پر کسی کمزوری کا مظاہرہ کیا ہو۔ ان میں سے کسی نے اپنی رہائی کی خواہش ظاہر کی ہو یا ان میں سے کسی کی ہمت پر کوئی حرف آنے پایا ہو، ان خواتین نے بڑے صبر و استقلال کے ساتھ تمام مصائب برداشت کیے اور جس پامردی کے ساتھ ان کے مردوں نے حق پر جانیں قربان کیں تھیں اسی پامردی اور جرأت کے ساتھ وہ حق کی استعانت میں اسیری کے مصائب جھیلتی رہیں، ان خواتین کے ایمان و یقین کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے کبھی اپنے وارثوں پر ماتم نہیں کیا بلکہ جب روئیں تو حسینؑ کی خاطر، جب پرسا دیا تو زینبؑ کو اور جب تذکرہ کیا تو اس علمبردار حق و صداقت کا جس پر انھوں نے ہنستے ہوئے سب کچھ قربان کر دیا تھا!

بنی ہاشم کی خواتین نے تو اس معرکہ میں وہ کارنامے انجام دیے ہیں جن کو صرف "محیر العقول" کے لفظ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ زینبؑ نے جس بے جگری سے اپنی اولادوں کو حق پر قربان کیا ہے، جس جرأت کے ساتھ تمام مصائب کا مقابلہ کیا ہے اور جس شان کے ساتھ دشمنوں کے درباروں میں حق کا پرچم بلند کیا ہے اس کی مثال "تاریخِ عالم میں ملنا محال ہے۔

ہم ان خواتین کے کارناموں کا ایک سرسری تذکرہ پہلے ہی کر چکے ہیں اور اب اس کا اعادہ نہیں کرنا چاہتے لیکن فداکاری کی ایک مثال ضرور ایسی ہے جسے یہاں پیش کر دینا لازمی ہے تاکہ ہاشمی خواتین کے ولولۂ محبت حسینی کی تصویر

ہماری نگاہوں کے سامنے آجائے!

عاشور کا دن ڈھل چکا ہے، حسینؑ اور ان کے ساتھی موت سے ہم آغوش ہو چکے ہیں، خیمے جلائے جا چکے ہیں، سیّدانیاں لٹ چکی ہیں ——— کہ اچانک گیارھویں رات کا پیلا اور دھندلا چاند نمودار ہوتا ہے، دن حسینؑ کے غم میں رات کی کالی عبا پہن لیتا ہے۔

یزیدی لشکر کے سپاہی جنگ کی تھکن دور کرنے کے لیے سو جاتے ہیں لیکن آلِ رسولؐ کی قسمت میں آرام کہاں؟ سیدانیاں یہ جانتی ہیں کہ کل ہمارا لٹا ہوا قافلہ کوفہ روانہ ہو جائے گا اور ہم ہمیشہ کے لیے اپنے عزیزوں کے دیدار سے محروم ہو جائیں گے۔ چنانچہ مجبور سیّدانیاں، دُکھ کی ماری قتل گاہ میں آتی ہیں۔ اور ہر خاتون اپنے وارث کی محبت پر اشک فشانی میں مصروف ہو جاتی ہے۔

یزیدی لشکر کا مورّخ حمید بن مسلم یہ واقعہ دیکھ رہا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ میں سیدانیوں کی حالت کا اندازہ کرنے کے لیے میدان میں آیا، میں نے دیکھا کہ ہر شہید کی میت پر رونے والے موجود ہیں لیکن ایک سمت دو کمسن بچوں کی لاشیں پڑی ہیں جن پر کوئی رونے والا نہیں۔ یہ منظر دیکھ کر میں اس مقام پر پہنچا جہاں حسینؑ کی نعش تھی اور ایک بی بی اس نعش پر نوحہ کناں تھی، میں سمجھ گیا کہ یہ حسینؑ کی بہن زینبؑ ہیں میں نے اُن سے عرض کیا "بی بی! سب شہیدوں پر تو رونے والے موجود ہیں، لیکن میں نے دو بچوں کی ایسی لاشیں دیکھی ہیں جن پر کوئی ماتم کرنے والا نہیں ہے، کیا ان بچوں کا کوئی عزیز

حسینی قافلہ میں موجود نہیں ہے، جو ان کی لاشوں پر آنسو بہا لیتا!"

یہ سننا تھا کہ زینبؑ نے اک آہ بھری اور بولیں "بھائی! وہ بچے اسی دکھیاری کے ہیں لیکن اگر میں ان کی نعش پر چلی جاتی تو حسینؑ کی لاش پر کون ماتم کرتا؟ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ فرزند زہراؑ کی لاش تنہا پڑی رہے اور فرزندانِ زینبؑ کی لاش پر ماں نوحہ کناں ہو؟"

یہ تھا فداکاری کا وہ جذبہ جو کربلا کی خواتین میں موجزن تھا! ——— کیا انسانی تاریخ اس کی مثال پیش کر سکتی ہے؟

کمسن مجاہد

حسینؑ نے اپنے فیض تعلیم سے جہاں بڑوں میں حق پر مر مٹنے کا جذبہ پیدا کر دیا تھا وہیں بچوں میں بھی بے پناہ ولولہ جہاد بیدار کر کے ان کو حق کے سچے اور جانباز سپاہیوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ چنانچہ کربلا کے میدان میں حسینی قافلہ کے کمسن بچوں نے جو کردار انجام دیا ہے، وہ انسانیت کے لیے ناقابل فراموش ہے!

حسینیؑ جماعت جن فداکاروں پر مشتمل تھی ان میں کئی بچے بھی شامل تھے ان سب کے حالات تو اس مختصر سے کتابچہ میں بیان نہیں کر سکتا البتہ ان میں سے چند ایک کی کیفیت ضرور عرض کروں گا۔ تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ حسینؑ نے اپنے بچوں میں کس قیامت کی للّہیت، فداکاری اور حق پرستی پیدا کر دی تھی اور کربلا کے میدان میں حسینؑ نے جن بچوں کو پیش کیا وہ بھی اپنے جوش حق پرستی میں کسی طرح اپنے بڑوں سے کم نہیں تھے!

عاشور کی رات ہے، اصحاب حسینی ایک خیمہ میں جمع ہیں، حسینؑ انھیں بتلا رہے ہیں کہ کل ہمیں موت سے سابقہ ہے اور ہمیں مرجانا ہے تاکہ حق کو حیات جاوید حاصل ہو جائے۔ اصحاب پوری خاموشی اور پورے عزم کے ساتھ حسینؑ کی تقریر سن رہے ہیں، اچانک بارہ تیرہ سال کا ایک بچہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور پوچھتا ہے "چچا! کیا کل میں بھی شہید ہو جاؤں گا!" حسینؑ سر سے پیر تک بچہ کو دیکھتے ہیں اور اس کی قلبی کیفیت کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں! جانتے ہیں کہ کم سن بچہ ہے اور پھر یتیم ہے

تین دن کی بھوک اور پیاس کا ستایا ہوا ہے اس نے میدانِ جنگ کی سختیاں بھی نہیں جھیلی ہیں۔ اس لیے امتحاناً سوال کرتے ہیں۔ "قاسمؑ تمہیں موت کیسی معلوم ہوتی ہے؟" سوال عجیب تھا۔ لیکن جواب اس سے بھی عجیب تر تھا، عرض کی: "چچا! مجھے موت شہد سے بھی زیادہ شیریں معلوم ہوتی ہے!" حسینؑ نے دیکھ لیا کہ حق کی تعلیم کا اثر کافی گہرا ہے اور قاسمؑ کے قدموں میں آخر تک لغزش پیدا نہیں ہو سکتی، چنانچہ جواب دیا "ہاں بیٹا! کل تم بھی مارے جاؤ گے اور تمہارا چھ مہینہ کا ننھا بھائی علی اصغرؑ بھی شہید کیا جائے گا! قاسمؑ نے حق کی راہ میں موت کی خوشخبری سنی اور خاموش ہو گئے، رات گذر گئی، دن نکلا، دوپہر ڈھلتے ڈھلتے انصار حسینیؑ شہید ہو گئے، اب عزیزوں کی باری آئی، جعفر اور عقیل کی اولادیں حق پر قربان ہو چکیں۔ تو قاسمؑ حسینؑ کے حضور میں حاضر ہوئے، عرض کی، "چچا! اب مجھے بھی موت کی اجازت مرحمت فرمائیے!" حسینؑ نے قاسمؑ پر سراپا ایک نظر ڈالی، قاسمؑ کو دیکھ کے حسنؑ کی یاد تازہ ہو گئی، دل تڑپ اٹھا اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ قاسمؑ نے چچا کی صورت دیکھی اور خاموش خیمہ میں واپس چلے گئے، ایک کونہ میں بیٹھ کے رونا شروع کیا۔ ماں نے جو اپنے لال کے رونے کی آواز سنی تو قریب آئی اور پوچھا "کیا ہوا قاسمؑ؟ کیوں رو رہے ہو؟" عرض کی "مادرِ گرامی! چچا مرنے کی اجازت نہیں دیتے!" یہ کہا اور پھر سسکیاں بھرنے لگے۔ ام فروہ کے چہرے پر بے چینی کے آثار نمودار ہو گئے، "خدایا! کیا میرا بچہ شرف شہادت سے محروم رہے گا؟ کیا حسنؑ کی آل حق پر قربان ہونے کی سعادت حاصل نہ کر سکے گی؟ کیا میں قیامت کے دن فاطمہ زہراؑ کے سامنے سرخروئی کی عزت حاصل نہ کر سکوں گی؟" یہ تھے وہ خیالات جو مادرِ قاسمؑ کے ذہن میں گردش کرنے لگے، ام فروہ کی بیتابی بڑھنے لگی، اُدھر قاسمؑ اشک فشانی میں مصروف ہیں، ادھر ماں کے پُرنور چہرے پر آنسو ڈھلک آئے، لیکن اچانک ماں کے ذہن میں ایک خیال

پیدا ہوا ، آنسو رُک گئے ۔ چہرے پر طمانیت کی لہریں دوڑنے لگیں۔ فرمایا ، قاسمؑ! تیرے باپ نے مرتے وقت تیرے بازو پر ایک تعویذ باندھ دیا تھا اور کہا تھا کہ جب تم پر بہت کٹھن وقت آئے تو اس تعویذ کو کھول کر پڑھ لینا ، بیٹا آج سے زیادہ کٹھن وقت اور کب آ سکتا ہے ؟ اس تعویذ کو کھولو ، شاید اس کی مدد سے میری اور تمہاری آرزو پوری ہو جائے !" قاسمؑ نے ماں کے حکم کی تعمیل کی ، تعویذ کھولا تو حسینؑ کے نام حسنؑ کا خط برآمد ہوا ۔ خط کیا نکلا گویا قاسمؑ کے دل کی مراد پوری ہو گئی ، دوڑتے ہوئے میدان میں پہنچے اور باپ کا خط چچا کی خدمت میں پیش کر دیا ، حسنؑ نے کچھ اس قسم کی عبارت لکھی تھی :

"بھیّا ! میں کربلا میں نہیں ہوں گا کہ تم پر اپنی جان قربان کر سکوں ، ہاں قاسمؑ کو اپنی جگہ چھوڑتا ہوں ، اسے مرنے کی اجازت دے دینا ۔ تاکہ کربلا کے معرکۂ حق و باطل میں میرا خون بھی شامل ہو جائے ۔"

حسینؑ نے مرحوم بھائی کا وصیت نامہ پڑھا ، قاسمؑ کے چہرہ پر نگاہ ڈالی ، وفورِ محبت میں آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ بھتیجے کو کلیجہ سے چمٹا کر رونا شروع کیا ، جب خوب رو چکے ، دل کی بھڑاس نکل گئی تو اذنِ جنگ عطا کیا ۔ قاسمؑ شاد ہو گئے چہرہ پر مسکراہٹ کی گنگا جمنی لہریں دوڑ گئیں ۔ حق پر مرنے کی سعادت ! دین پر جان نچھاور کرنے کی عزت ! حسینؑ کے قدموں پر نثار ہو جانے کا شرف ! قاسمؑ کو اپنی موت پر جتنا بھی ناز ہوتا وہ کم تھا ۔ چچا نے اجازت دے دی تو عباسؑ نے گود میں اٹھا کے گھوڑے پر بٹھا دیا ۔ تلوار کمر میں حمائل کر دی ، قاسمؑ چلے ، یزید کے لشکریوں کا بیان ہے کہ ہم نے دیکھا کہ حسینؑ کے لشکر سے ایک چاند نکلا اور ہماری سمت آ رہا ہے ۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ خیبر گیر کا پوتا اور حسنؑ

کے دل کا ٹکڑا ہے، قاسمؑ نام ہے۔ نبی زادے کو آتے دیکھ کر دشمنوں نے تلواریں سونت لیں، کمانوں میں تیر سنبھال لیے گئے۔ نیزوں کی انیاں بلند ہوگئیں۔ لیکن وہ بچہ جس کی رگوں میں حق پرستی کا لہو جوش مار رہا تھا، ان حربوں سے کیا متاثر ہوتا، وہ بڑھا اور بڑھتا رہا۔ آخر دشمن کی صفیں تھیں اور اس کی تلوار۔ جس بچہ نے کبھی رن بھومی کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ اس نے سینکڑوں ناریوں کو جہنم کی راہ دکھا دی۔ آخر ایک شقی نے ایسی تلوار ماری کہ سر پارہ پارہ ہوگیا، کمسن مجاہد زمین پر آرہا۔ چچا کو امداد کے لیے آواز دی، حسینؑ بڑھے کہ قاسمؑ کو بچالیں، علیؑ کے شیر کو جلال میں دیکھ کے لشکر عمر سعد میں بھگدڑ مچ گئی اور اس بھگدڑ کا نتیجہ یہ ہوا کہ قاسمؑ کی لاش پامال سم اسپاں ہوگئی جسم ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا اور حسنؑ کا لال ہمیشہ کے لیے ریگ زار کربلا میں معصومیت کی نیند سونے پر مجبور ہوگیا۔ ایک حق پرست بچہ مرگیا لیکن حق کی رگوں میں ایک نیا خون داخل کرگیا۔ قاسمؑ مرگئے لیکن مذہب کی صداقتوں کو ہمیشہ کے لیے زندہ کرگئے، حسنؑ کا لال خاک و خون میں مل گیا، لیکن حق پرستی کے جواہر اس شان سے تابناک ہوگئے کہ قیامت تک ان کی ضو میں کوئی کمی نہیں ہوسکے گی!

عونؑ و محمدؑ ——— جعفر طیار کے پوتے اور علی مرتضیٰؑ کے نواسے زینبؑ کے لال اور حسینؑ کے بھانجے، دس اور گیارہ سال کے سن۔ ماموں کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ "مولا! اب ہمیں بھی مرنے کی اجازت دیجیے۔ ہمارے جد جعفر نے آپ کے جد رسول اللہؐ پر جان قربان کی تھی۔ اماں کی خواہش ہے کہ آج ہم بھی اس رسم کی تجدید کریں اور آپ کے قدموں پر نثار ہوکر حق کی شان کو دوبالا کرجائیں!"

حسینؑ نے بچوں پر نگاہ ڈالی، یہ کمسنی اور یہ شوقِ جہاد، بہ تمام کے اجازت عطا فرمائی۔ دونوں بھیجے گئے، دیکھنے میں تو کمسن تھے لیکن رگوں میں جعفر اور علی کا خون تھا۔ زینبؑ کی آغوش میں پلے اور حسینؑ کے مکتبِ حق پرستی میں پروان چڑھے تھے، لڑے اور ایسی گھمسان کی جنگ لڑے کہ دیکھنے والے عش عش کر اُٹھے، چھوٹے چھوٹے نیچوں سے لاشوں کے انبار لگا دیے۔ لیکن آخر کب تک لڑتے؟ مرنے آئے تھے، لڑنے نہیں آئے تھے، چنانچہ شہید ہو گئے۔ حسینؑ پہنچے، دونوں کی لاشیں اٹھا کے خیمہ میں لائے، ماں نے جو بچوں کی لاشیں دیکھیں تو خوشی سے چہرہ دمک اٹھا، خاک پر سر رکھ دیا، عرض کی "بارالٰہا! تیرا لاکھ لاکھ شکر اور احسان کہ تو نے میری قربانی قبول فرمائی، تو نے زینبؑ کو فاطمہؑ کے سامنے سرخرو کر دیا اور تو نے میرے بچوں کو حق پر مرجانے کی وہ ابدی سعادت عطا فرمائی جس پر زینبؑ ابد الآباد تک ناز کر سکتی ہے!

دوسری عورت ہوتی تو یہ منظر دیکھ کر اس کا جگر شق ہو جاتا، کلیجہ منہ کو آجاتا۔ دل پھٹ جاتا اور آنکھیں بے نور ہو جاتیں۔ لیکن یہ زینبؑ تھیں، شیرِ خدا کی بیٹی اور حق پرست حسینؑ کی حق آگاہ بہن جنھوں نے بچوں کی موت پر سجدۂ شکر ادا کیا، اپنی قربانی کے قبول ہونے پر مسکرا دیں اور اس طرح دنیا کی خواتین کے لیے ایک ایسی جاودانی مثال قائم کر گئیں جس کی نظیر چشمِ فلک کو بھی ملنا محال ہے!

مسلم بن عقیل کے بچے آٹھ دس سال کا سن، لیکن شیروں کے شیر، دلیروں کے دلیر، باپ مر چکا، ماں بیوہ ہو چکی، دو ننھے ننھے بھائی کوفہ میں باپ کے ساتھ مر چکے، لیکن حق پرستی اور جاں نثاری کے ولولہ میں کوئی کمی نہیں، سن کم سہی لیکن فدائیت کا جذبہ بھرپور جوانی پر تھا، میدان میں گئے، لڑے اور شہید ہو کے دنیا کے بچوں کو یہ سبق دے

گئے کہ سن کی کمی حق کی راہ میں کوئی معنی نہیں رکھتی، اگر حق پر وقت پڑ جائے تو اسی جوش جہاد اور عزم موت کا مظاہرہ کرنا چاہیے، جو ہمارے دلوں میں موجزن ہے، کم سنی کا عذر کبھی نہ کرنا، اگر حق کی خاطر جان کی بازی لگا دینے کا وقت آجائے تو ہمارا نام لے کر میدان میں کود جانا، موت آتی ہے تو آئے، حق اور انسانیت کو ضرور زندہ رہنا چاہیے، مر جاؤ لیکن حق کو زندہ کر جاؤ، یہی ہمارا پیغام ہے، وہ پیغام جسے ہم اپنے خون سے کربلا کے ذروں پر صرف اس لیے نقش کر رہے ہیں، کہ آنے والی نسلیں اسے سمجھیں، اس سے فائدہ اٹھائیں اور اسی پر عمل کر کے دنیا میں حقانیت کا نام زندہ رکھیں!

حسینؑ گھوڑے سے زمین پر گرے دس سال کے کمسن عبداللہ بن حسنؑ نے دور سے یہ منظر دیکھا، نصرت حق کا جذبہ جوش میں آیا، گھبرا کے دوڑے، دشمنوں کے جھرمٹ سے گذرتے امام تک اس وقت پہنچے جب ایک ظالم حسینؑ پر تلوار مارنا چاہتا تھا، ادھر اس کی تلوار امام کی جانب چلی، اُدھر بچہ نے امام کو بچانے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر دیے، وار بھرپور تھا، عبداللہ بن حسنؑ کے دونوں ہاتھ کٹ گئے، لیکن حسینؑ بچ گئے، بچہ خاک و خون میں تڑپنے لگا، حسینؑ نے غش سے آنکھیں کھول کے عبداللہ کا یہ حال دیکھا تو کلیجہ سے لگایا اچانک حرملہ بن کاہل آگے بڑھا، کمان کاندھے سے اتاری، تیر چلّہ میں رکھ کر سر کیا جس سے مظلوم عبداللہ نے چچا کی آغوش میں دم توڑ دیا۔

علی اصغرؑ کا تذکرہ میں اس کتابچہ کے ابتدائی صفحات میں کر چکا ہوں اور اسی لیے اعادہ نہیں کر رہا ہوں لیکن اس مقام پر یہ ضرور عرض کروں گا کہ اس ننھے مجاہد کی شہادت نے واقعہ کربلا میں حق

اور باطل کا ایسا واضح امتیاز پیدا کیا ہے جس کے بعد حسینؑ کی حقانیت اور یزید کی درندگی میں کسی کو اشتباہ باقی نہیں رہ سکتا ، علی اصغرؑ کی شہادت معیار کامل ہے حقانیت کے لیے ۔ ایک امتحان ہے حسینؑ کی صداقت کا ، ایسا مکمل امتحان ، جس کے بعد کسی دوسرے ثبوت کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی !

میدان کربلا میں کئی اور بچے شہید ہوئے ۔ لیکن ان کی جنگ اور شہادت کی تفصیلات کا پتہ نہیں چلتا ۔ ہمیں ان تفصیلات میں جاننے کی بھی ضرورت نہیں اس لیے کہ ہمارا مقصد مذکورہ بالا واقعات سے بھی پورا ہو جاتا ہے ۔ اور یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ حسینؑ نے بچوں میں حق پرستی کی وہ روح پھونک دی تھی جس کے نتیجہ میں بچوں نے بھی اس فداکاری کا مظاہرہ کیا جس کا مظاہرہ ان کے بڑوں نے کیا تھا !

عرب کی چلچلاتی ہوئی گرمی میں تین دن تک مسلسل بھوک اور پیاس کی تکالیف برداشت کرنا اور اُف نہ کرنا ہی حسینی قافلہ کے بچوں کا ایک ایسا مایۂ ناز کارنامہ ہے جس پر عقیدت کے سر ان بچوں کے سامنے جھک جاتے ہیں اور پھر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس ہجوم مصائب میں بھی ان کی ہمت نہیں ٹوٹی ، ان کی شجاعت پر حرف نہیں آیا ، اور وہ شیرانہ انداز میں تلواریں سونت کے دشمن کے مقابلہ میں آگئے تو ہماری حیرت کی واقعی کوئی انتہا نہیں رہتی ۔ بچوں میں اتنا صبر ، اتنی شجاعت ، اتنی فداکاری ، اتنی حق پرستی اور مذہب کے لیے ایسا جذبۂ قربانی پیدا کر دینا واقعی حسینؑ کا بہت بڑا کمال تھا اور کمال تعلیم کی یہ ایک ایسی منزل ہے جہاں بہت سے دوسرے روحانی رہنما اور مذہبی پیشوا حسینؑ کے مقابلے میں آنے کی جرأت نہیں کر سکتے ۔

حسینیؑ قافلہ میں بہت سی کمسن لڑکیاں اور بچیاں بھی تھیں ۔ ان میں سکینہؑ

اور رقیہ بھی شامل تھیں، جن کی عمریں چار پانچ سال سے زیادہ نہیں تھیں۔ ان کے علاوہ بھی دس بارہ سال سے کم عمر کی کئی بچیاں تھیں۔ جنھوں نے تین دن کی بھوک پیاس نہایت ہی صبر و استقامت سے برداشت کی۔ اسیری کے مصائب جھیلے، دشمنوں کے درّے کھائے۔ گردنوں میں رسیاں بندھوائیں جن کے کانوں سے بندے اس طرح چھینے گئے کہ کان لہو لہان ہو گئے۔ جن کو رسیوں میں اس طرح جکڑا گیا کہ گلے خون میں لت پت ہو گئے، جن کی پشت خاردار کوڑوں سے چھلنی کر دی گئیں لیکن ان کے لبوں سے کبھی ایک لفظ بھی ایسا برآمد نہیں ہوا جسے منافی صبر قرار دیا جائے۔ انھوں نے کبھی دشمنوں کے لیے بد دعا نہیں کی، خاموشی کے ساتھ مصائب جھیلتیں رہیں اور حسینؑ کی مظلومیت و حقانیت کو عالم پر آشکار کرتی رہیں۔ ان بچیوں نے صبر و برداشت، حق پرستی، ایثار اور جفاکشی کی جو مثالیں ہمارے لیے چھوڑی ہیں وہ واقعی قابل فخر ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حسینؑ نے جہاں لڑکوں میں اپنے فیضِ تعلیم سے حق پرستی کے اعلیٰ جوہر پیدا کر دیے تھے، وہیں لڑکیوں میں بھی حق پرستی اور حق آگاہی کا زبردست جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ اسی جذبہ کا وہ مظاہرہ تھا جو عاشورہ محرم کے روز نیز اس کے بعد ایک سال تک برابر کیا جاتا رہا اور آج اسی کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ حق زندہ ہے بلکہ ان کمسن بچیوں کا نام بھی تاریخ کے صفحات پر زرّیں حروف میں لکھا نظر آ رہا ہے!

حُسینیؑ شیر

حق و صداقت کی قربان گاہ پر حسینؑ نے جو عظیم المرتبت قربانیاں پیش کیں، ان میں ان جوانوں کی جاں نثاری، شیر دلی، شجاعت اور ایثار نفس اپنی مثال آپ ہے، جو کربلا میں اپنے آقا کے اشارہ ابرد پر اپنی جانیں قربان کر کے حق کو حیاتِ جاودانی عطا کر گئے، اپنے گرم اور ابلتے ہوئے خون سے ایمان کے چراغوں کی جوت جگا گئے، اپنی بھرپور جوانیاں لٹا کے صداقت و حقانیت کو اس لازوال شباب کی نعمت سے مالا مال کر گئے، جو اس وقت تک بڑھاپے میں تبدیل نہ ہو سکے گا جب تک ان پاک اور مقدس شہیدوں کی یاد انسانیت کے دل میں دھڑکن اور حق کی چھاتی میں گرمی پیدا کرتی رہے گی!

میں ان میں سے صرف دو جوانوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں ـــــ ایک اٹھارہ سال کے علی اکبرؑ اور دوسرے بتیس سال کے عباسؑ بن علیؑ! ـــــ ایک حسینؑ کے دل کا چین، اور دوسرا علیؑ کے دل کا ٹکڑا، ایک ام لیلیٰ کے ارمانوں کی تصویر اور دوسرا شیر خدا کی تمناؤں کا پیکر، ایک حسینؑ کی بارگاہ میں پیغمبرؐ اسلام کا تحفہ اور دوسرا امت محمدی کی قربان گاہ پر علی مرتضیٰؑ کا ہدیہ!

علی اکبرؑ حضرت امام حسینؑ کے منجھلے صاحبزادے تھے - آپ کی والدہ کا اسم گرامی ام لیلیٰ تھا، آپ پیغمبرؐ اسلام کی شبیہہ تھے، اتنی مکمل شبیہہ کہ

جب مسلمان اپنے رسولؐ کی زیارت کرنا چاہتے تھے تو آپ کو دیکھ لیا کرتے تھے، آپ بے حد حسین، خوش اخلاق، عبادت گذار اور نیکوکار تھے اور اپنے کردار کے اعتبار سے بھی پیغمبرؐ کی جیتی جاگتی تصویر معلوم ہوتے تھے، آپ کا اٹھارھواں سال تھا کہ حسینؑ نے مدینہ چھوڑا اور کربلا کے بن میں حق و باطل کی فیصلہ کن جنگ کی ٹھان لی۔ حق پرست علی اکبرؑ نے بھی اس جنگ میں اپنے حق پرست باپ کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ آپ بھی حسینیؑ قافلہ کے ہمراہ روانہ ہو گئے!

عرب کا ریگستان، چلچلاتی ہوئی دھوپ، تپتی ہوئی ریت، باد سموم کے شعلہ بار جھونکے، چاروں طرف وحشت اور ویرانی، اداسی اور تنہائی انسانی آبادی کا دور دور نشان نہیں، انتہائی پر ہول اور خوف ناک منظر ——— لیکن حسینؑ حق کے متوالے حسینؑ، اس ہولناک اور صبر آزما پس منظر کا لحاظ کیے بغیر، عواقب پر حقارت کی نظریں ڈالتے، مصائب پر مسکراتے، طوفانوں سے کھیلتے، موت کا پنجہ مروڑتے، برابر آگے بڑھتے جا رہے ہیں، علی اکبرؑ باپ کے پہلو بہ پہلو چل رہے ہیں، اچانک حسینؑ کے دل میں خیال آیا ——— "علی اکبرؑ جوان ہے، یقیناً اس کے دل میں جوانی کی امنگیں ہوں گی، جینے کے ارمان ہوں گے، اور میں اسے موت کی وادی میں لے جا رہا ہوں۔ یہ زینبؑ کی آنکھوں کا تارا اور ام لیلیٰ کا راج دلارا ہے۔ اسے ماں اور پھوپھیوں نے بڑے نازوں سے پالا ہے، اس نے نہ تو کبھی رن بھومی کی شکل دیکھی ہے، اور نہ تلواروں کی آنچ سہی ہے! ——— ایسی حالت میں اسے قربانگاہِ صداقت میں پیش کرنے سے پہلے اس کا امتحان ضرور لے لینا چاہیئے! اس کے دل کی قوت اور اس کے قلب کی مضبوطی کو پورے طور سے جانچ لینا چاہیے! کربلا کا معرکہ بہت سخت اور ہولناک ہوگا! وہاں جوانی

اور حق میں ٹکراؤ ہو گا، زندگی کی مسرتوں اور موت کی ویرانی کا مقابلہ ہو گا! ایسی حالت میں یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ علی اکبرؑ کا رویہ کیا ہو گا؟ وہ جوانی اور زندگی کی عارضی رعنائیوں کا ساتھ دے گا، یا شہادت کی ابدی نعمتوں سے ہمکنار ہونا پسند کرے گا؟ وہ "اپنے لیے" جینا پسند کرے گا یا "حق کے لیے" مرجانے کو ترجیح دے گا؟ ——— اس کا فیصلہ ابھی کر لیا جانا ضروری ہے! ——— اس خیال کے آتے ہی حسینؑ نے ایک پُراسرار جملہ اپنی زبان سے ادا کیا ——— انا للہ وانا الیہ راجعون (ہم اللہ کے لیے ہیں اور آخر اللہ ہی کی جانب لوٹ جانے والے ہیں!)

علی اکبرؑ نے یہ جملہ سنا تو عرض کی "بابا! ویسے تو یہ جملہ ہر وقت ادا کیا جا سکتا ہے لیکن اس وقت آپ کی زبان سے یہ جملہ ادا ہونے میں کیا مصلحت ہے؟"

حسینؑ سمجھ گئے کہ تیر عین نشانہ پر بیٹھا ہے، جوان بیٹے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے "علی اکبرؑ! میں نے ابھی سُنا کہ جیسے کوئی غیبی آواز مجھ سے یہ کہہ رہی ہے کہ "حسینؑ تم عراق کی طرف بڑھ رہے ہو اور موت تمہاری طرف بڑھ رہی ہے!" ———

یہ کہا اور مولا نے اپنی نگاہیں علی اکبرؑ کے چہرے پر گاڑ دیں!

علی اکبرؑ نے باپ کا ارشاد سنا اور عرض کی "بابا! کیا ہم حق پر نہیں ہیں!"

ارشاد ہوا "بیٹا! ہم ضرور حق پر ہیں!"

عرض کی "بابا!" اگر ہم حق پر ہیں تو ہمیں موت کا کیا ڈر؟"

حسینؑ جس جواب کے طالب تھے وہ ان کو حاصل ہو گیا، علی اکبرؑ نے باپ کو بتلا دیا کہ میری جوانی حق پرستی کی راہ میں حائل نہیں

ہو سکتی، مجھے زندگی عزیز نہیں ہے، حق عزیز ہے اور اگر حق کی راہ میں موت آجائے تو میں اسے شرف و سعادت تصوّر کرتے ہوئے بخوشی قبول کر لوں گا!

حسینؑ مطمئن ہو گئے اور قافلہ اپنی راہ طے کرتا رہا، آخر منزل آگئی اور وہ وقت بھی آپہنچا جو امتحان کا وقت تھا!

عاشور کی قیامت خیز رات ختم ہوئی، صبح صادق کا نور آسمان پر نمایاں ہوا، حسینی قافلہ کے عبادت گذار نماز صبح کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے، علی اکبرؑ آگے بڑھے اور انھوں نے اذان کہنا شروع کی۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر، (تمام بڑائیاں صرف اللہ کے لیے ہیں) اشہد ان لا الٰہ الا اللہ (میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں!) اشہد ان محمد الرسول اللہ (میں گواہی دیتا ہوں کہ (میرے نانا) محمدؐ اللہ کے رسول ہیں!)

اور کربلا کا میدان پیغمبرؐ اسلام کی آواز سے گونجنے لگا!

نماز ختم ہو گئی، حسینؑ حق کے متوالوں کو ساتھ لیے میدان میں آئے، فوج کے تین حصے کیے گئے ایک حصہ کے سالار حبیب بن مظاہر اور دوسرے جزو کے سردار زہیر بن قین مقرر کیے گئے، تیسرا حصہ علی اکبرؑ کی کمان میں دیا گیا اور عباسؑ علمبردار اس مختصر سی فوج کے سپہ سالار بنائے گئے، جنگ چھڑی، ایک کے بعد ایک مجاہد میدان میں پہنچا، لڑا اور شہید ہوا۔ یہاں تک کہ دوپہر ڈھل گئی۔ انصار مارے گئے۔ اور عزیزوں کی باری آئی —— ان عزیزوں میں جو شخص سب سے پہلے میدان میں پہنچا وہ شاہزادہ علی اکبرؑ تھے!

علی اکبرؑ باپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مرجانے کی اجازت چاہی، اٹھارہ برس کا کڑیل جوان نازوں کا پالا، خوبصورت، خوش اخلاق

عابدؑ، پرہیز گار، رسولؐ کی تصویر ——— اور موت کی اجازت ؟

بڑا سخت امتحان تھا یہ حسینؑ کے لیے ! ——— باپ اور جوان بیٹے کو تلواروں سے ٹکڑے ہونے کے لیے بھیج دے ! اپنی زندگی کی کمائی کو موت کے ظالم ہاتھوں میں سونپ دے ! اپنے ارمانوں کی جیتی جاگتی تصویر کو خونی برچھیوں کے سپرد کر دے ! ——— اور پھر کس لیے ؟ ——— کسی ظاہری فائدہ کے لیے نہیں ، حکومت کے لیے نہیں ، دولت کے لیے نہیں ، شہرت کے لیے نہیں ! ——— صرف اس لیے کہ علی اکبرؑ کی موت حق کی زندگی کے لیے ضروری ہے ، علی اکبرؑ کے جسم اطہر کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے پر ہی اسلام کی بقا کا دارومدار ہے ۔ ایمان کو اپنی حیات کے لیے علی اکبرؑ کا جوان اور گرم لہو درکار ہے اور روحانیت کے جھلملاتے ہوئے دیئے کی جوت بڑھانے کے لیے علی اکبرؑ کے خون کی ضرورت ہے ! ——— عام آدمی کبھی مجرد اصولوں پر اپنے کڑیل جوان کی زندگی قربان کر دینے کی جرأت نہیں کر سکتا ، لیکن حسینؑ عام آدمی نہیں تھے ، حسینؑ عالم روحانیت کے تاجدار اور دنیائے حق پرستی کے سردار تھے ، حسینؑ ایمان کا مجسمہ اور عشق الٰہی کے پیکر تھے ، حسینؑ کے نزدیک اولاد کی محبت اصول کی محبت کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی چنانچہ آپ نے علی اکبر کو مرنے کی اجازت دے دی ، علی اکبرؑ آپ سے اجازت لے کر خیمہ میں تشریف لے گئے ، ماں سے ملے ، پھوپھی سے رخصت ہوئے ، باہر آئے ، باپ کو سلام آخری کیا اور میدان کی طرف روانہ ہو گئے !

علی اکبرؑ میدان کی جانب بڑھ رہے ہیں اور حسینؑ کی نگاہیں اپنے فرزند پر جمی ہوئی ہیں ——— آج حسینؑ اور ابراہیمؑ میں مقابلہ ہو رہا ہے ۔ ابراہیم بھی بیٹے کی موت پر رضامند ہو گئے تھے لیکن

اس طرح کہ اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لی تھی تاکہ بچہ کی موت اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکیں، لیکن حسینؑ آنکھیں کھولے پوری طمانیت کے ساتھ علی اکبرؑ کو موت کے بھیانک غار میں جاتے دیکھ رہے تھے اور خاموش تھے، ان کو اگر کچھ فکر تھی تو بس اتنی کہ ان کی قربانی قبول ہو جائے اور جہاں ابراہیمؑ کے ہاتھ اسمٰعیل کی موت کے تصوّر سے تھرتھرا گئے تھے وہاں ان کے قدم علی اکبرؑ کو خاک و خون میں تڑپتا دیکھ کے ثابت رہ گئے!

ادھر حسینؑ کی نگاہیں علی اکبرؑ پہ جمی ہوئی تھیں اور اُدھر ام لیلیٰ[1] درخیمہ سے حسینؑ کو دیکھ رہی تھیں۔ لیلیٰ کے دل میں بھی وہی لگن تھی جو حسینؑ کے دل میں تھی، ماں یہ معلوم کرنے کے لیے بیتاب تھی کہ اس کا لال حق پر قربان ہو گیا، اس کے پارہ جگر نے اپنی جوانی اسلام پر نثار کر دی، اس کے کلیجہ کا ٹکڑا حسینؑ کے قدموں پر جان نثار کر کے ماں کے دودھ کا حق ادا کر گیا۔ اور اس کی آنکھوں کا نور خدا اور ایمان کی راہ میں اس طرح کام آیا کہ حق پرستی پر چھائی ہوئی تاریکیاں ہمیشہ کے لیے روشنی میں تبدیل ہو گئیں! ـــــ آج ام لیلیٰ کے سینہ میں اپنے کڑیل جوان کا سہرا دیکھنے کا ارمان نہیں تھا، آج ان کو صرف ایک ہی ارمان تھا اور وہ یہ کہ ان کا نورِ نظر حق پر قربان ہو جائے اور اس طرح قیامت کے دن ان کو یہ موقع مل جائے کہ وہ اپنے رب سے اس بیش بہا قربانی کی قیمت کے طور پر حق پرستوں کی نجات کا پروانہ حاصل کر سکیں! وہ حسینؑ کو دیکھ رہی تھیں اس لیے کہ وہ یہ جانتی تھیں کہ حسینؑ باپ ہیں، ان کے سینہ میں باپ کا دل

---

[1] کتب مقاتل کے بعض مؤلفین کے نزدیک حضرت ام لیلیٰ المیہ کربلا میں موجود نہیں تھیں۔

ہے ، علی اکبرؑ پر جو کچھ بیتے گی اس کے اثرات باپ کے چہرہ پر ضرور نمایاں ہوں گے اور اس طرح اپنے لال کی جنگ کی کیفیت معلوم ہوتی رہے گی ! یہ تھا وہ جذبہ جس کے ماتحت ام لیلیٰ پسِ پردہ حسینؑ کو دیکھ رہی تھیں اور ادھر حسینؑ علی اکبرؑ کی جنگ کا حال ملاحظہ فرمانے میں مشغول تھے !

اِدھر تو یہ کیفیت تھی اور اُدھر علی اکبرؑ کا یہ عالم تھا کہ وہ بجلی اور طوفان کے مانند ۳۵ ہزار خونخواروں کے لشکر سے جنگ میں مصروف تھے ۔ تین دن کا بھوکا پیاسا نوجوان حقانیت اور ایمان کی طاقتوں کو اپنے سینہ میں سموئے بازوؤں میں خیبر شکنی کی قوتیں سنبھالے ، دل میں حسینی عزم اور ہمت کی شمع جلائے ، حق کی راہ میں جہاد کر رہا تھا اور اس شان سے جنگ کر رہا تھا ، کہ علیؑ کی یاد تازہ ہوتی جا رہی تھی ، ایک بجلی تھی جو سپاہیوں کے دل میں چمک رہی تھی ، ایک شیر تھا جو غزالوں سے کھیل رہا تھا ، ایک تلوار تھی جو دشمنوں کا رشتۂ حیات کاٹ رہی تھی ، جنگ جاری تھی ۔ ایک سو بیس دشمن تلوار کے گھاٹ اتار دیے گئے ، بقیہ نے فرار پر قرار کیا اور شاہزادہ ، خون میں نہایا باپ کی خدمت میں واپس آیا حسینؑ نے اپنے بہادر فرزند کی پیشانی پر بوسہ دیا ، بیٹے نے عرض کی "بابا ! پیاس مارے ڈالتی ہے !"

حسینؑ کا دل تلملا اُٹھا ، لیکن آپ نے پورے صبر و سکون سے کام لیتے ہوئے فرمایا "علی اکبرؑ ! اپنی زبان میرے منہ میں دے دو !"

علی اکبرؑ نے اپنی زبان باپ کے مُنہ میں دے دی اور فوراً ہٹا لی ۔ عرض کی "بابا ! آپ کی زبان تو میری زبان سے بھی زیادہ

خشک ہے!"

حسینؑ چند لمحے تک خاموش رہے اور پھر بولے "جاؤ! علی اکبرؑ اس مرتبہ تمہارے جدّ رسولؐ اللہ تمہیں جام کوثر سے سیراب کریں گے!"

علی اکبرؑ نے امام کا حکم سنا اور پھر میدان کی سمت روانہ ہو گئے، جنگ شروع ہوئی، دشمن کے اسّی سپاہی قتل ہوئے، اچانک ایک شخص نے کمین گاہ سے نیزہ مارا، جو سینہ کو توڑ کے پشت کے پار نکل گیا، علی اکبرؑ نے گھبرا کر گھوڑے کے گلے میں بانہیں ڈال دیں، اب کیا تھا، بیہوش مجاہد پر تلواریں برسنے لگیں اور تھوڑی ہی دیر میں علی اکبرؑ گھوڑے سے زمین پر آرہے، گرتے گرتے انھوں نے باپ کو آخری سلام کیا۔ اور بے ہوش ہو گئے!

حسینؑ نے علی اکبرؑ کی آواز سُنی تو چہرہ خوشی سے دمک اُٹھا، دونوں ہاتھ آسمان کی جانب بلند کئے اور عرض کی "خداوندا! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے میری پیش کی ہوئی قربانی قبول فرمائی!" ——— یہ کہا اور میدان کی جانب روانہ ہو گئے، دشمن پر اس درجہ رعب غالب تھا کہ اس نے راستہ دے دیا اور حسینؑ علی اکبرؑ کے سرہانے پہنچ گئے، دیکھا کہ نوجوان بیٹا، زخموں سے چُور، ریگ گرم پر پڑا ایڑیاں رگڑ رہا ہے، سینہ میں نیزہ پیوست ہے اور اس کے صدمہ سے علی اکبرؑ آنکھیں تک کھولنے سے معذور ہیں۔ عام انسان ہوتا تو یہ منظر دیکھ کر اس کا کلیجہ پھٹ جاتا، غم کی شدت جسم اور روح میں افتراق پیدا کر دیتی، لیکن یہ حسینؑ تھے! ——— صبر و استقلال کے پیکر، تسلیم و رضا کے بندے! ———

آپ جھکے، زانو سے علی اکبرؑ کا سینہ دبایا اور دونوں ہاتھوں سے تھام کے نیزہ کھینچ لیا، نیزہ سینہ سے نکلا تو اس کے ساتھ خون کا فوارہ بلند ہوا، جوان اور گرم خون، حسینؑ نے اس خون کو چلو میں لے لیا اور اپنے مُنہ پر مل لیا۔ علی اکبرؑ نے آنکھیں کھول دیں، عرض کی "بابا! آپ پر میرا آخری سلام! بابا! آپ پریشان نہ ہوجیے۔ نانا رسول اللہؐ میرے لیے جامِ کوثر لائے ہیں، تاکہ میری پیاس دور کر دیں!" ——— یہ کہا اور ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے، حسینؑ کی آنکھوں میں دنیا تاریک ہوگئی، لیکن چپ، ساکت! اس لیے کہ ابھی تو حسینؑ کو حق کے لیے اور بھی بہت سی قربانیاں دینا تھیں، بیٹے کی موت پر رونے کے لیے حسینؑ کے پاس مہلت ہی کہاں تھی؟ حسینؑ نے دیکھا کہ علی اکبرؑ داغِ مفارقت دے گئے تو دامن جھاڑ کے اُٹھے، اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا اِلیہِ راجعون ط (ہم سب خدا کے لیے ہیں اور خدا ہی کی جانب لوٹ جانے والے ہیں) کہتے ہوئے جوان بیٹے کی نعش اٹھائی، لا کے شہدار کی صف میں رکھ دی اور دوبارہ احیائے حق کی مہم میں مصروف ہو گئے۔

علی اکبرؑ کی موت اس سچی لگن کی شدّت ظاہر کرتی ہے جو حسینؑ کے دل میں موجزن تھی ——— بھلا کس انسان کا یہ کلیجہ ہوگا کہ وہ جوان بیٹے کے سینہ میں برچھی پیوست دیکھے اور اف نہ کرے، اپنی اٹھارہ برس کی کمائی کو ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھے اور خاموش رہے جو ان کی خون آلود نعش اپنے ہاتھوں سے اٹھائے اور آنکھوں سے ایک آنسو نہ ٹپکنے دے، اپنے لاڈلے کو موت کی آغوش میں ڈال دے اور پوری طمانیت کے ساتھ جنگ جاری رکھے ——— یہ کام حسینؑ ابن علیؑ کے سوا اور کسی دوسرے انسان سے ممکن نہیں، قلب کی

یہ قوت ، عقائد کی یہ پختگی ، ایمان کی یہ شدّت ، اصولوں کا یہ احترام اور حق کی یہ محبت تبھی ممکن ہو سکتی ہے ، جب انسان کو اپنی حقانیت کا عین الیقین ہو اور حسینؑ نے علی اکبرؑ کی موت کے سلسلہ میں جس بے مثل کردار کا مظاہرہ کیا ہے وہ ان کے عین الیقین ـــــ حق کے آنکھوں دیکھے یقین ـــــ کا کھلا ہوا ثبوت ہے!

عباسؑ بن علیؑ ، حسینؑ کے سوتیلے بھائی تھے ، بتیس برس کا سن تھا اتنے خوبصورت تھے کہ آج تک تاریخ ان کو " بنی ہاشم کا چاند" کہہ کے یاد کرتی ہے ۔ قیامت کے دلیر اور وفا شعار تھے ، امام نے ان کو مجاہدین حق کا سپہ سالار مقرر کیا تھا ، لشکر حسینی کے علمدار تھے ۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ انھوں نے علَم کی آن اس طرح قائم رکھی کہ آج تک حسینؑ کے ماننے والے جہاں محرم میں حسینؑ کا سوگ مناتے ہیں وہیں عباسؑ کی یاد میں علَم اٹھایا کرتے ہیں ۔ عباسؑ نے کربلا میں محض ایک دن علمداری کی ، لیکن اس شان سے کی ، کہ آج علَم کا تصوّر عباسؑ سے کچھ اس طرح وابستہ ہو گیا ہے کہ علَم کا لفظ آتے ہی ذہنوں میں عباسؑ کا خیال اور عباسؑ کا نام آتے ہی علَم کا تصور پیدا ہو جاتا ہے ۔ دنیا کی وسیع تاریخ میں لاکھوں لڑائیاں لڑی گئی ہیں اور ان سب لڑائیوں میں فریقین کے علمدار شریک رہے ہیں ۔ ان علمداروں نے تاریخ میں اپنی شجاعت کے ہزاروں نقش چھوڑے ہیں ، خود پیغمبرِ اسلام کے علمبردار حضرت علیؑ کی شجاعت زبان زد عوام ہے ، لیکن عباسؑ نے کربلا میں ایک مختصر سے لشکر کی جس شان سے علمداری کی ، اس کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی اور یہی وجہ ہے کہ جہاں عوام تاریخ کے صفحات پر بکھرے ہوئے ہزاروں جرنیلوں کے ناموں سے قطعاً ناواقف ہیں وہیں عباسؑ کا نام ہر دل پر کندہ اور عباسؑ کا

غمؑ ہر گھر میں جلوہ گر نظر آتا ہے!

جب علی اکبرؑ، قاسمؑ، عونؑ، محمدؑ اور حسینؑ کے دوسرے عزیز قتل ہو چکے تو لشکر حسینی میں صرف عباسؑ اور ان کے تین چھوٹے بھائی باقی رہ گئے، تینوں جوان، خوبصورت اور دلیر، حضرت عباسؑ نے ان میں سے عونؑ بن علیؑ کو حکم دیا کہ اب تم جاؤ اور حق پر قربان ہو جاؤ عون گئے اور اس شدت سے جنگ کی کہ لشکر یزید بھاگ کھڑا ہوا، آپ پیچھا کرتے رہے اور تقریباً چھ میل تک تعاقب کرتے چلے گئے وہاں جا کے آپ شہید ہوئے چنانچہ آج تک آپ کا مزار کربلا سے چھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے!

ان کے بعد عثمانؑ بن علیؑ اور جعفرؑ بن علیؑ میدان میں گئے، لڑے اور شہید ہوئے!

اب عباسؑ نے اپنے بارہ سالہ فرزند فضلؑ کو بلایا اور فرمایا "بیٹا! تو بھی جا اور حسینؑ پر قربان ہو جا، میں تین بھائیوں اور کئی بھتیجوں، بھانجوں کا داغ سہہ چکا ہوں، اب چاہتا ہوں کہ تیرا داغ بھی سہہ لوں تاکہ میری قربانی کی تکمیل ہو جائے!"

فضل نے باپ کا حکم سنا، تلوار ہاتھ میں لی، میدان میں پہنچا، لڑا اور شہید ہو گیا![1] اب خود عباسؑ کی باری تھی، بھائی کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کی، "مولا! اب، سینہ پھٹا جاتا ہے اب تو مجھے بھی مرنے کی اجازت دیجیے!

حسینؑ نے مایوسانہ نگاہوں سے عباسؑ کے چہرہ پر نگاہ ڈالی اور بولے "بھیا! تم تو میرے لشکر کے علمدار ہو، لشکر کی زینت ہو"۔

عرض کی "مولا! اب وہ لشکر ہی کہاں ہے، جس کا میں علمدار تھا، حبیب و مسلم مر چکے، زہیر و ہلال قربان ہو چکے، علی اکبرؑ و قاسمؑ حضور

۱- جنابِ فضل کربلا میں شہید نہیں ہوئے۔ (ادارہ)

کے قدموں پر جانیں نچھاور کر چکے، جعفر، عقیل اور علیؑ کی اولادیں حق پر نثار ہو چکیں، اب باقی ہی کون ہے؟ ——— مولا! اب اپنے غلام کو بھی مرنے کی اجازت دے دیجیے تاکہ میں بھی آپ کے قدموں پر جان دے کے شہادت کے شرف سے ہمکنار ہو جاؤں!"

حسینؑ جانتے تھے کہ یہ علیؑ کا شیر ہے، لڑنے جائے گا تو طبقے الٹ دے گا اور ہو سکتا ہے کہ لشکر یزید بھاگ کھڑا ہو تو مقصد شہادت کی تکمیل ادھوری رہ جائے ——— اس لیے آپ نے عباسؑ کو جنگ کی اجازت دینے سے انکار کر دیا، جب عباسؑ نے اصرار کیا تو آپ نے فرمایا کہ خیمہ میں جاؤ اور بہنوں سے رخصت لے لو!"

عباسؑ خیمہ میں گئے تو جان سے زیادہ پیاری بھتیجی سکینہؑ پیروں سے چمٹ گئی ——— "چچا پیاس مارے ڈالتی ہے، سینہ کباب ہو رہا ہے، میرے چچا! جہاں سے بھی ممکن ہو، چند قطرے پانی لا دیجیے، تاکہ گلا تر کر لوں ورنہ میں پیاس سے مر جاؤں گی!" ——— عباسؑ کے لیے بھتیجی کے یہ جملے تیر و نشتر سے کم نہ تھے، آنکھوں میں آنسو آ گئے، کہا "سکینہؑ، مشکیزہ لاؤ، میں تمہارے لیے ابھی پانی لاتا ہوں، سکینہؑ نے مشکیزہ لا کر دے دیا، عباسؑ باہر آئے، عرض کی "مولا! بچوں کی پیاس نہیں دیکھی جاتی، اجازت دیجیے کہ ان کے لیے پانی لے آؤں!"

حسینؑ نتائج سے باخبر تھے اجازت دی لیکن اس ہدایت کے ساتھ کہ پانی لانے کی کوشش کرنا۔

مجسمہ شجاعت و وفا حضرت عباسؑ نے امام کے حکم پر سر تسلیم خم کر دیا اور دریا کی سمت روانہ ہو گئے، ایک ہاتھ میں علم لشکر، دوسرے میں نیزہ اور دوش پر مشکیزہ۔ عمر سعد نے دریا پر چار ہزار سپاہیوں کا پہرہ بٹھا رکھا تھا، ان سپاہیوں نے جب علمدار لشکر حسینی کو آتے دیکھا تو

غواریں سونت کے سامنے آگئے، جنگ شروع ہوئی، علیؑ کا شیر ایک کے بعد ایک صفیں توڑنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں لشکر میں بھگدڑ مچ گئی، راستہ صاف ہوگیا، اور عباسؑ گھوڑے سمیت دریا میں اُتر گئے، مشکیزہ بھرا اور باہر تشریف لے آئے ——— اس مقام پر یہ یاد رکھنا ضروری ہے، کہ عباسؑ تین دن کے پیاسے تھے۔ دن بھر عزیزوں اور دوستوں کی لاشیں اٹھاتے رہے، خود ابھی ایک سخت جنگ لڑ چکے تھے، ایسی حالت میں بشریت کا اقتضیٰ یہ تھا کہ وہ دریا پر قبضہ حاصل کرنے کے بعد اپنا گلا تر کر لیتے اور چند گھونٹ پانی سے اپنی پیاس بجھا لیتے لیکن آپ کی حد درجہ وفاداری نے اس کی اجازت نہیں دی کہ اس وقت جبکہ حسینؑ اور ان کے بچے پیاسے تھے آپ پانی پی لیتے، چنانچہ آپ پیاسے ہی دریا سے باہر آگئے، اور دوبارہ جنگ میں مصروف ہوگئے!

آپ کی ساری جد وجہد اس چیز تک محدود تھی کہ جس طرح بھی ممکن ہو، مشکیزہ خیام حسینی تک پہنچا دیا جائے، تاکہ ان ننھے ننھے بچوں کو پانی مل جائے جو عرب کی جھلسا دینے والی گرمی میں تین دن سے پیاس کا تعب جھیل رہے تھے ——— دوسری طرف دشمن اس پر تُلا ہوا تھا کہ خیمہ تک پانی کا ایک قطرہ نہ پہنچنے دیا جائے۔ چنانچہ عمر سعد کی ساری فوج آپ کے مقابلہ میں صف آرا ہوگئی، اکیلا مجاہد، ایک ہاتھ میں علَم، دوسرے ہاتھ میں نیزہ اور دوش پر مشکیزہ سنبھالے برابر آگے بڑھ رہا تھا، گھمسان کی جنگ جاری تھی، لاشوں پر لاشیں گر رہی تھیں کہ اچانک ایک شخص نے آکر پشت پر وار کیا جس سے عباسؑ کا داہنہ ہاتھ کٹ کے زمین پر آرہا، آپ نے فوراً بائیں ہاتھ میں نیزہ سنبھالا، علَم کو بغل میں دبایا، مشکیزہ سنبھالا اور پھر لڑتے ہوئے آگے بڑھنے لگے، تھوڑی ہی دیر میں ظالموں نے بائیں ہاتھ کو بھی جسم سے جدا کر دیا، عباسؑ کی

شجاعت نے اب بھی یہ گوارا نہیں کیا کہ عَلَم لشکر حسینی سرنگوں ہو جائے چنانچہ آپ نے دانتوں میں علم اور مشکیزہ داب لیا اور گھوڑے کو ایڑ دیتے، تلواریں کھاتے، خون میں نہاتے آگے بڑھنے لگے، اسی اثنا میں ایک شقی نے سر پر گرز سے وار کیا جس سے آپ کا سر پاش پاش ہو گیا اور اب گھوڑے پر سنبھلنا دشوار ہو گیا لیکن حسینؑ کے پیاسے بچوں کے لیے پانی پہنچانے کی جو لگن دل میں لگی ہوئی تھی اس نے اس حالت پر بھی آپ کو آگے بڑھتے رہنے پر مجبور کیا، چنانچہ آپ کے قدم اب بھی آگے بڑھتے رہے اچانک ایک تیر مشکیزہ پر لگا۔ مشک کو چھید کے آپ کے سینہ میں پیوست ہو گیا، پانی بہہ گیا اور پانی کے ساتھ ہی آپ کے دل کی طاقت بھی جواب دے گئی، آپ گھوڑے سے زمین پر گرے اور بے ہوش ہو گئے!

امام نے دور سے دیکھا کہ عَلَم سرنگوں ہوا، سمجھ گئے کہ عباسؑ شہید ہو گئے، یہ صدمہ اتنا سخت تھا کہ آپ نے کمر تھام لی اور فوراً میدان کی جانب روانہ ہوئے، لشکر نے راستہ روکا تو آپ نے تلوار نیام سے نکالی لی، شیر خدا کو جلال میں دیکھ کر دشمنوں نے راستہ دے دیا اور آپ وہاں پہنچے جہاں عباسؑ دونوں شانے کٹائے، خون میں نہائے بے ہوش پڑے تھے، امام بھائی کے سرہانے پہنچے، سر اٹھا کے اپنی آغوش میں رکھ لیا، آواز دی تو عباسؑ کو ہوش آیا، عرض کی "مولا! آخری خواہش ہے کہ مرتے دم آپ کی زیارت کر لوں لیکن مشکل یہ ہے کہ ایک آنکھ میں تیر پیوست ہے اور دوسری آنکھ میں سر کا خون جم گیا ہے، ہاتھ کٹ چکے ہیں اس لیے آنکھ صاف کر کے حضور کا دیدار کرنے سے معذور ہوں!"

حسینؑ نے یہ مایوسانہ جملے سنے تو کلیجہ پر آری چل گئی! فوراً

عبا کے دامن سے عباسؑ کی آنکھیں صاف کیں، مجاہد نے امامؑ کے چہرۂ انور پر نگاہ ڈالی اور مسکراتے ہوئے جنّت کو سدھار گئے ۔

امامؑ کے لئے یہ وقت حد درجہ صبر آزما تھا، آخری ساتھی بھی بچھڑ گیا۔ لشکر کا علمدار دل کی قوّت اور سکینہؑ کا سہارا بھی چھوٹ گیا، لیکن واہ رے صابر و شاکر حق پرست! کہ اس صدمہ پر بھی اف نہ کی، عَلم اٹھایا اور واپس چلے آئے، اس لئے کہ جیسا میں پہلے عرض کر چکا ہوں، حسینؑ کے پاس کسی عزیز کی نعش پر ایک آنسو تک بہانے کا وقت نہیں تھا۔ حق کی زندگی کے لئے ابھی حضرت امام حسین علیہ السّلام کو بہت کچھ کرنا تھا۔ وقت کم تھا اور کام بہت۔ حق ان سے جہاں خونیں قربانیوں کا طالب تھا وہیں کلیجوں کے ٹکڑوں کی جدائی پر ماتم نہ کرنے کا بھی طالب تھا۔ حضرت امام حسین علیہ السّلام کو اپنے جگر گوشوں کی موت پر رونے کی بھی اجازت نہیں تھی اور یہ ایک ایسی عجیب و غریب قربانی امام حسین علیہ السّلام کو دینا پڑ رہی تھی جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں دستیاب ہونا محال ہے! ــــ لیکن حسینؑ، حق پرست و حق آگاہ حسینؑ، جہاں کربلا کے بن میں ہر قسم کی جانی و مالی قربانیاں پیش کرنے پر تُلے ہوئے تھے، وہیں یہ عظیم نفسیاتی قربانی بھی پیش کر رہے تھے کہ اپنے جذبات کا خون ہوتے دیکھیں اور اُف نہ کریں، اپنی محبتوں کے رشتے کٹتے دیکھیں اور آنسو نہ بہائیں۔ اپنے دل کے ٹکڑوں کو خاک میں ملتے دیکھیں اور خاموش رہیں۔ عباسؑ، علی اکبرؑ، قاسمؑ کو دم توڑتے دیکھیں اور صبر سے کام لیں ــــ اور یہ صرف اس لئے کہ حق کی زندگی کے لئے یہ سب کچھ ضروری تھا! حق کو موت کے چنگل سے نجات دلانے کے لئے، اللہ کے نام کی عظمت قائم رکھنے کے لئے، ایمان کی کشتِ زار کو

سرسبز و شاداب دیکھنے کے لئے اور نانا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے پیغام کو بقائے دوام عطا کرنے کے لئے جذبات کی یہ پامالی بھی ضروری تھی ۔

حضرت امام حسین علیہ السّلام نے یہ قربانی بھی دی اور آج اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ دنیا امام حسینؑ کے ان جگر گوشوں پر خون کے آنسو بہا رہی ہے ، جن پر حضرت حسین علیہ السّلام کو ایک آنسو ٹپکانے کا موقع نصیب نہیں ہو سکا تھا ! ☆

جوانؔ مرد بوُڑھے

حق کی خاطر قربانیاں پیش کرنے کے سلسلے میں جہاں نادان بچّوں نے اپنے لہو سے تاریخ سازی کا فریضہ انجام دیا، وہیں کمر خمیدہ بوڑھوں نے بھی حضرت امام حسین علیہ السّلام کی کمان میں ایسی جواں مردی کا مظاہرہ کیا، جس پر خود جوانی ناز کر سکتی ہے۔ حسینیؑ قافلہ میں کئی بزرگ ایسے تھے جن کی عمریں ستّر سے متجاوز ہو چکی تھیں، کمر خم ہو چکی تھی، بال پک چکے تھے، بصارت جواب دے رہی تھی، بازو شل ہو گئے تھے۔ جسموں کے ساتھ دلوں کی قوّت بھی ختم ہونے کے قریب تھی ـــــ لیکن جب وہ حق کی خاطر تلواریں سنبھالے میدان میں اُترے تو رَن بھومی ان کی شجاعت پر دنگ رہ گئی، دنیا نے دیکھا کہ اچانک ان کے بازوؤں میں فولاد کی صلابت اور پتھروں کی سنگینی پیدا ہو گئی۔ ان کے جسموں میں جوانی کی پھُرتی اور تیزی جھلکنے لگی۔ ان کے دلوں میں پہاڑوں کا استقلال، شیروں کا عزم اور مست ہاتھیوں کی ہمّت لہریں لینے لگی۔ ان کی آنکھوں سے شعلے اور ان کی تلواروں سے آگ برسنے لگی اور ان کے ٹھنڈے خون میں اس قیامت کی حرارت پیدا ہو گئی کہ عرب کی تپتی ہوئی ریتی بھی ان سے پناہ مانگنے لگی۔ وہ جب کمر کو پٹکے باندھے، ابروؤں کو رومالوں سے کسے، منہ سے کف برساتے، نگاہوں سے بجلیاں گراتے، ہاتھوں میں تلواریں سونتے، جہاد کے میدان میں اُترے تو شیروں کا کلیجہ پانی اور پتھر کا دل آب آب ہونے لگا۔

حق پرستی اور سوزِ ایمانی نے ان کے دلوں میں ایک آگ بھڑکا دی تھی. چنانچہ انہوں نے کربلا کے معرکہ میں جس صبر و ایثار، جس ہمت و استقلال جس فداکاری و قربانی اور جس بے پناہ شجاعت کا مظاہرہ کیا، وہ دنیا بھر کے جوانوں کے لئے ایک زندہ مثال کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ کبرسنی میں تین دن تک بھوکے پیاسے رہنا، تلوار کی آنچ سہنا، زخم کھا کھا کے مسکرانا اور انتہائے طمانیت کے ساتھ جان دینا، ان بوڑھے مجاہدوں کا ایک ایسا کارنامہ ہے، جس پہ خود جوانی رشک کر سکتی ہے۔

میں اس مقام پہ کربلا کے چند بوڑھوں کا مثال کے طور پر تذکرہ کرنا چاہتا ہوں تاکہ ان حضرات کی فداکاری کی ایک ہلکی سی جھلک نگاہوں کے سامنے آجائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ کربلا کے میدان میں جن کبیرالسن مجاہدوں نے حق پہ جانیں قربان کیں ان کا کردار کیا تھا!

انسؓ بن حارث اسدی اصحابِ رسولؐ میں سے ہیں۔ سو سے زیادہ عمر تھی، حدیث کے راوی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی خبرِ شہادتِ امام حسینؑ سنی اور اس کے منتظر رہنے لگے۔ واقعۂ کربلا میں وہ بہت کبیرالسن ہو چکے تھے مگر یہ جذبۂ قربانی تھا کہ حضرت امام حسینؑ کے ساتھ واقعۂ کربلا میں حاضر ہوئے اور اجازتِ جہاد حاصل کی۔ اپنی کمر چست باندھی اور اپنی بھونوؤں کو جو آنکھوں پہ لٹک آئی تھیں، اونچا کر کے رومالی سے باندھا، امامؑ ان کو دیکھ کر رو رہے تھے اور دعائے خیر دے رہے تھے۔ شکراللہ لک یا شیخ۔ اے بڈھے مجاہد خدا تیرے حسنِ عمل کی قدر کرے۔ وہ جنگ کر کے درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

حبیب بن مظاہر اسّی سال سے زیادہ سن، کمر خم، جسم پر جھُریاں پڑی ہوئی ابروؤں کے سفید بال آنکھوں پر سایہ کئے ہوئے۔ بڑھاپے سے اعضاء میں تھرتھری لیکن ادھر حضرت امام حسینؑ کی جانب سے حق پر مر مٹنے کی خاطر طلبی کا خط پہنچتا ہے ادھر کمرِ ہمت باندھ کے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ بیوی بچّوں کو چھوڑ دیتے ہیں، کوفہ سے گھوڑا اُڑاتے کربلا پہنچتے ہیں اور خوشی خوشی مرنے والوں کے قافلہ میں شریک ہوجاتے ہیں۔ عاشور کی شب آتی ہے تو انصارِ حسینی کو اپنے خیمہ میں جمع کرتے ہیں اور فرماتے ہیں :-

"بھائیو! کل یوم امتحان ہے، خبردار اگر ہماری زندگی میں امام حسینؑ یا آلِ رسولؐ کے کسی فرد پر خدانخواستہ کوئی آنچ آگئی تو قیامت کے دن رسول اللہؐ کو صورت دکھانا محال ہوجائے گی، اس لئے تمہارا فرض ہے کہ تم بنی ہاشم سے قبل ہی اپنی جانیں قربان کردینا تاکہ جب رسول اللہؐ کے سامنے جاؤ تو فخر کے ساتھ یہ کہہ سکو کہ جب تک ہماری جان میں جان رہی تب تک آپکی آل پر حرف نہیں آسکا!"

ادھر حبیبؓ انصارِ حسینی کو یہ ہدایت کررہے تھے، ادھر ہلال بن نافع گھبرائے ہوئے خیمہ میں حاضر ہوئے عرض کی : "حبیب! یہاں بیٹھے کیا کررہے ہو؟ ثانی زہرا کو ہماری وفاشعاری پر شبہہ ہے۔ میں نے خود اپنے کانوں سے سُنا ہے کہ زینبؑ امام حسینؑ سے یہ پوچھ رہی تھیں کہ بھیا! آپ نے اپنے ساتھیوں کا امتحان کرلیا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہ آپ کا ساتھ چھوڑ دیں؟۔ حبیبؓ یہی وقت ہے جب ہمیں اپنی فداکاری کا مظاہرہ کرکے فاطمہؑ کی بیٹی کو مطمئن کردینا چاہیئے"

حبیبؓ نے یہ جُملے سُنے تو تلوار ٹیک کے اُٹھے، اصحاب کو ساتھ لیا، بارگاہِ حسینیؑ پر حاضر ہوئے آواز دی، امام حسینؑ باہر آئے تو دیکھا اصحاب

کی پوری جمعیت باہر ہے۔ حبیبؓ آگے آگے ہیں۔ پوچھا: "دوستو! اتنی رات آنے کا کیا سبب؟" حبیبؓ کی آنکھوں سے آنسو چھلک آئے، ننگی تلوار گردن پر رکھ لی اور عرض کی: "مولا! ہم نے سنا ہے کہ ثانی زہراؑ کو ہماری وفاداری پہ شک ہے، آپ ان تک ہمارا سلام پہنچا دیجیے اور ان سے کہہ دیجیے کہ ہم ان کے اشارہ کے منتظر ہیں، ان کا حکم ہو تو ہم اپنی گردنیں اپنے ہاتھوں سے کاٹ کے پیش کر دیں۔" امامؑ اس مظاہرۂ محبت و فداکاری سے حد درجہ متأثر ہوئے اور آپ نے اپنے اصحاب کو دعائیں دے کے رخصت کر دیا۔

روز عاشورہ حبیبؓ حسینی لشکر کے میمنہ کے سردار مقرر کئے گئے، ۳۵ آدمی آپ کی کمان میں تھے۔ جنگ کا آغاز ہوتے ہی عمر سعد کے میسرہ کے دس ہزار سواروں نے لشکر حسینی کی جانب باگیں اٹھا دیں، حبیب نے مقابلہ کا فیصلہ کیا، اپنی مختصر سی جماعت سمیت میدان میں آئے۔ حسینی شیروں کو حکم دیا کہ وہ دو زانو ہو کر زمین پر بیٹھ جائیں اور برچھوں کو اسطرح سیدھا کر لیں کہ ڈانڈیں زمین سے ملی اور انیاں سامنے کی جانب بلند رہیں۔ عمر سعد کے سپاہی گھوڑے اڑاتے حبیبؓ کی جماعت پر آ پڑے لیکن دانشمند حبیبؓ ان سے زیادہ لڑائیاں دیکھے ہوئے تھے اگلی صف کے گھوڑے جیسے حبیبؓ تک پہنچے، ویسے ہی انہیں چمکتی ہوئی انیوں اور لچکتے ہوئے نیزوں کا سامنا کرنا پڑا۔ گھوڑے ہوا سے باتیں کرتے چلے آ رہے تھے۔ جیسے ہی ان کی گردنوں پر برچھے پڑے، ویسے ہی وہ الٹ گئے۔ اگلے سوار پچھلے سواروں پر گرے اور چونکہ عمر سعد کے سارے سپاہی ایک دوسرے کے عقب میں آ رہے تھے، اس لئے محض اگلی صف کے گھوڑوں کا منہ پھر جانے اور ان کے الٹ جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام صفیں الٹ گئیں، ہزاروں سوار زمین پر

آرہے، گھوڑوں نے ہلچل مچادی، سینکڑوں سپاہی ان کے ٹاپوں تلے کچلے اور بقیہ کو اپنی جانیں بچاکے فرار اختیار کرنا پڑا۔ حبیبؓ نے محض تین آدمیوں کی مدد سے دس ہزار سواروں کو شکست دی، ان کو فرار پہ مجبور کردیا۔ یہ ان کی جنگی مہارت کا ایک ایسا کارنامہ تھا جس پہ خود دشمن تک کو بھی خراجِ عقیدت پیش کرنا پڑا۔ اور آج تک ان کی اس لڑائی کو معرکۂ کربلا کا ایک اعلیٰ شاہکار تسلیم کیا جاتا ہے۔

حبیبؓ بڑے بہادر اور سپہ سالار ہونے کے ساتھ ہی بہت بڑے عالم بھی تھے، چنانچہ خود نواسۂ رسولؐ کو بھی ان کی علمیت کا اعتراف تھا۔ ان کے علم ہی نے ان کے سینہ میں عرفان کی وہ شمع روشن کی تھی، جس کے نور کو شہادت نے بقائے دوام عطا کردی ہے۔ وہ ایک حق پرست کی حیثیت سے حق کی خاطر لڑے اور کئی باطل پرستوں کو قتل کرنے کے بعد مسکراتے ہوئے موت سے ہمکنار ہوگئے۔ کربلا میں انھوں نے جس وفاداری اور فداکاری کا مظاہر کیا ہے اسے آج تک امام حسینؑ کے ماننے والے اپنے آنسوؤں کی شکل میں زندہ رکھے ہوئے ہیں اور جیسے ہی معرکۂ کربلا کے تذکرہ میں لفظ "دوست" استعمال کیا جاتا ہے، ویسے ہی سننے والوں کے ذہنوں میں جنابِ حبیبؓ کی تصویر گھوم جاتی ہے۔ امام حسینؑ کے ماننے والوں کے نزدیک "حبیبؓ بن مظاہر" اور "دوست" مترادف لفظ بن گئے ہیں اور یہ باہمی فداکاری کی ایک ایسی مثال ہے جس پر واقعی فخر کیا جاسکتا ہے!

مسلم بن عوسجہ — نوّے برس سے اوپر سن، کمر خمیدہ، بال سفید، ماتھے پر کثرتِ سجود کا نشان، بڑے عابد و زاہد، قائم اللیل، دائم الصوم کوفہ میں زندگی کی آخری گھڑیاں گزار رہے ہیں۔ ایک دن بازار میں تشریف لے جاتے ہیں تو دیکھتے

ہیں کہ شہر میں لشکر کی تیاریاں ہو رہی ہیں، پوچھتے ہیں کہ فوجیں کہاں جا رہی ہیں؟ کس سے جنگ آ پڑی ہے؟ معلوم ہوتا ہے، حسینؑ سے! کوفہ کے سپاہی امام حسین علیہ السّلام سے لڑنے جا رہے ہیں۔ رسولؐ کے نواسے اور علیؑ کے بیٹے حسینؑ سے! سنتے ہی دل تلملا اٹھتا ہے، کلیجہ میں ایک برچھی سی کھُب جاتی ہے۔ ہاتھوں میں خضاب کی بوتل ہے۔ غصّہ میں اسے پھینک کر فرماتے ہیں:۔

"انشاءاللّٰہ! اب ان بالوں میں خون سے خضاب ہو گا"۔

سننے والے حیران کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا واقعی حضرت امام حسین علیہ السّلام کی نصرت کے لئے جائیں گے؟۔ کیا ان کو یزید کی طاقت اور ابنِ زیاد کے دبدبہ کی خبر نہیں؟۔ کیا ان کے سر پہ موت کھیل رہی ہے، جو یہ یوں دلیرانہ انداز میں کوفہ کے بھرے بازار میں حضرت امام حسینؑ کی امداد کا اعلان کر رہے ہیں؟ کیا ان کو نہیں معلوم کہ آج کے قانون میں آلِ رسول صلّی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی نصرت حکومتِ وقت سے بغاوت کے مترادف ہے؟ کیا یہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ حکومت کے پاس اپنے مخالفین کے لئے صرف ایک ہی چیز ہے، اور وہ ہے تلوار! ۔ یہ تھے وہ خیالات، جو سننے والوں کے ذہنوں میں گردش کر رہے تھے۔ جو مصلحت اندیشی پر ایمان کو قربان کر چکے تھے لیکن مسلم ان باتوں سے بے خبر، ذوقِ شہادت سے سرشار، گھر آئے، گھوڑے پر سوار ہوئے، کمر میں تلوار باندھی اور کربلا روانہ ہو گئے۔ حسینی قافلہ میں ایک اور جوانمرد بوڑھے کا اضافہ ہو گیا۔ اس بوڑھے کا جس کے بڑھاپے پر جوانی نثار تھی، عاشور کے دن مسلم بھی دوسرے فداکاروں کے ساتھ میدان میں گئے، لڑے، زخمی ہو کر

گرے، حسینؑ حبیبؓ بن مظاہر سمیت زخمی مجاہد کے سرہانے پہنچے، آواز دی تو مسلم نے غش سے آنکھیں کھول دیں، مصحفِ روئے حسینیؑ کی زیارت کی، حبیبؓ بولے :۔ "بھائی مسلم! اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ میں تمہارے بعد کچھ عرصہ زندہ رہوں گا تو تم سے کہتا کہ اس وقت کچھ وصیت کرو، جسے میں پورا کر دوں گا، لیکن میں خود پا برکاب ہوں، اس لئے وصیت کی خواہش کیا کروں؟" مسلم باوفا نے جواب دیا:۔ "نہیں حبیب! میں اس کے باوجود وصیت کروں گا اور وہ وصیت امام حسینؑ کے بارے میں ہے ۔ حبیب! حسینؑ پر آنچ آنے سے پہلے ان پر قربان ہو جانا" یہ وصیت کی اور ابدی نیند سو گئے۔

کیا جاں سپاری اور فداکاری کی اس سے اعلیٰ اور برتر کوئی مثال پیش کی جا سکتی ہے؟ ہرگز نہیں! مرتے دم بھی امام حسینؑ کا خیال، نہ اپنی بیوی کی فکر، نہ بچوں کا غم، دم توڑ رہے ہیں اور دوسروں کو امام حسینؑ پر مر مٹنے کی وصیت کر رہے ہیں۔ اس سے زیادہ وفاداری، محبت اور جاں نثاری بھلا کیا ہو سکتی ہے؟

بریر بن خضیر ہمدانی! ستر سال سے متجاوز عمر، کوفہ کے بہت بڑے عالم، قرآن کے حافظ اور متعلّم، ہزاروں کوفیوں کے اُستاد، قرآن و حدیث، موت کا خیر مقدم کرنے کوفہ سے کربلا چلے آئے۔ جنگ چھڑی تو امام حسینؑ نے دشمن پر اتمام حجت کرنے کے بعد آپ کو روانہ کیا کہ آپ لشکرِ یزید کو سمجھائیں۔ چنانچہ آپ میدان میں پہنچے اور ایسی زلزلہ افگن تقریر کی کہ دشمنوں کے دل لرز گئے، نگاہیں جھک گئیں، شرم سے پسینے چھوٹ گئے اور دشمن کے ہر سپاہی کو اپنے دل کے پردوں میں امام حسین علیہ السّلام کی حقانیت اور مظلومیّت کا اعتراف کر لینا پڑا۔ عمر سعد نے دیکھا کہ لشکریوں کا طور بگڑ رہا ہے

چنانچہ اس نے کمان میں تیر رکھا اور پہلا تیر خود سر کر کے جنگ کا آغاز کر دیا۔ پر یہ میدان سے پلٹ آئے، صرف اتنی دیر کے لئے کہ امامؑ سے رخصت ہو لیں۔ امامؑ سے ملے، موت کی اجازت لی اور سب سے پہلے شہید ہونے کا شرف حاصل کر کے تاریخ میں اپنا نام کر گئے۔

زہیر بن قین، حسینی میسرہ کے سپہ سالار، حضرت علیؑ کے ساتھی، جمل و صفین کے معرکے جھیلے ہوئے تجربہ کار سپاہی، عالم، عابد اور سرفروش مجاہد، اپنے خیمہ میں بیٹھے ہیں کہ امام حسینؑ کا قاصد آتا ہے اور مولا کا خط ان کے سپرد کرتا ہے۔ بیوی پوچھتی ہے کہ کس کا خط ہے؟ کہتے ہیں: امام حسینؑ کا خط ہے، مجھے بلایا ہے۔ بیوی کہتی ہے: پھر کیا ارادہ ہے؟۔ جواب دیتے ہیں: مجھے تیرا خیال ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ امام حسینؑ مرنے جا رہے ہیں اور مجھے بھی موت کی دعوت دے رہے ہیں! حق پرست بیوی عرض کرتی ہے:۔

"زہیر! آپ ضرور جائیے اور فرزندِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قربان ہو جائیے، آپکی یہ موت میرے لئے قابلِ فخر ہو گی"

زہیر بیوی کو اس کے عزیزوں کے حوالے کرتے ہیں اور خود امام حسینؑ کی خدمت میں پہنچ جاتے ہیں۔ عاشور کی شب کو جب امام حسینؑ اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے ان کو یہ ہدایت کرتے ہیں کہ وہ رات کی تاریکی میں اپنی جانیں بچا کے نکل جائیں تو زہیر تلوار ٹیک کے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، عرض کرتے ہیں:۔

"مولا! اگر مجھے قتل کر دیا جائے، قتل کر کے میری نعش جلا دی جائے، جلی ہوئی راکھ ہوا میں اڑا دی جائے اور میں پھر زندہ ہو جاؤں تو دوبارہ اسی شان سے قربان ہونگا۔ اگر مجھے ستر مرتبہ بھی قتل اور زندہ کیا جائے، تب بھی میں

آپ کی حمایت سے منہ نہ موڑوں گا اور ہر مرتبہ حق پر اسی ہمت سے اپنی جان نچھاور کر دوں گا، جس ہمت سے آج مرنے پر تیار ہوں !"

یہ تھا وہ جذبہ جو زہیر کے دل میں موجزن تھا اور آخر وہ اسی جذبہ کو لئے ہوئے معرکۂ کربلا میں شہید ہو کر ہمیشہ کیلئے شہیدوں کی فہرست میں اپنا نام اونچا کر گئے۔

عابس بن شبیب شاکری، ستّر سال سے اوپر سن، پیری سے جسم میں رعشہ، ہاتھوں میں تلوار اٹھانے کی بھی سکت نہیں۔ ہاتھ میں صرف ایک چھری لیکر میدان میں آئے لیکن شجاعت کا یہ عالم تھا کہ جدھر حملہ کرتے تھے اُدھر لوگ بھاگ کھڑے ہوتے تھے، کوئی مقابلہ کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ کوئی مقابلہ میں نہیں آتا تو روتے لگے اور بولے: "معلوم ہوتا ہے کہ میری قسمت میں شہادت کا شرف نہیں ہے" یہ کہا اور میدان میں کُرتہ اُتار کر بیٹھ گئے، چھری ہاتھ سے پھینک اور دشمن کو مخاطب کر کے فرمایا: "میں شہید ہونا چاہتا ہوں، حق پر قربان ہونا چاہتا ہوں، آؤ اور مجھے قتل کر دو" دشمنوں میں اب بھی اس کے قریب جانے کی ہمت نہیں تھی، چنانچہ دُور سے پتھراؤ شروع کیا گیا اور اس پتھراؤ کے نتیجہ میں آپ شرفِ شہادت سے ہمکنار ہو گئے۔

پیغمبر اسلامؐ کے صحابی جنابِ ابوذرؓ کا غلام جونؑ نوّے سال سے اُوپر سن، امامؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر مرنے کی اجازت طلب کرتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:-

"جون! تم بہت بوڑھے ہو، میں تم کو اجازت دیتا ہوں کہ تم میرے پاس سے چلے جاؤ اور اپنی جان کو خطرہ میں نہ ڈالو!" یہ جملہ سنتے ہی جونؑ کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے، آنکھوں میں خون اُبل آتا ہے، عرض کرتے ہیں: "مولا! کیا آپ یہ نہیں چاہتے کہ میرا حبشی خون آپ کے ہاشمی خون میں مل جائے، کیا

آپ یہ پسند نہیں کرتے کہ میرا سیاہ رنگ قیامت کے روز سفیدی میں تبدیل ہو جائے ؟ واللہ میں آپ پر اپنی جان نثار کروں گا تاکہ میدانِ قیامت میں سرخرو بن کے اٹھ سکوں !"

جونؔ حبش کے رہنے والے تھے، حضرت امام حسینؑ عرب تھے، جونؔ سے امام حسینؑ کی نہ کوئی قرابت تھی اور نہ کوئی عزیز داری ! دونوں میں صرف حق کا واسطہ تھا اور محض اسی تعلقات کی خاطر جونؔ مرنے پر تیار تھے ۔ ایک حبشی غلام ایک عربی حق پرست پر فدا ہونے پر آمادہ تھا اور آخر وہ اپنا ارادہ پورا کر کے رہا ۔ جونؔ کا حبشی لہو امام حسینؑ کے ہاشمی خون میں ایسا مِلا کہ قیامت تک جُدا نہیں کیا جا سکتا ۔ آج جونؔ حق پرستوں کی اسی محفل میں رونق افروز ہے، جہاں خاندانِ رسالتؐ کے چراغ جگمگا رہے ہیں ۔ پیغمبرِ اسلامؐ کے قانونِ مساوات نے حضرت بلالؓ حبشی کو عربوں کی محفل میں جگہ دے دی تھی لیکن امام حسینؑ کے قانونِ مساوات نے جونؔ کے خون کو اپنے پاکیزہ لہو میں ملا کے حق پرستوں کی اخوّتِ باہمی کی ایک ایسی تاریخی دستاویز تیار فرما دی، جس کے حروف ہمیشہ انسانیت کے صفحات پر خون کی بُوندیوں کی مانند جھلکتے اور چمکتے رہیں !

کربلا کے بوڑھے مجاہدین کا یہ مختصر سا تذکرہ نامکمل اور ناقص رہے گا، اگر اس میں اس ستاون سال کے بوڑھے مجاہد کا ذکر نہ کیا جائے، جو اس واقعہ کی جان اور معرکۂ کربلا کی رُوحِ حقیقی تھی ۔ کربلا کی وہ شمع فروزاں جس کے نور سے حق کی پیشانی آج تک جگمگا رہی ہے، صداقت کا وہ آفتاب جس کی ضیائیں آج بھی ساری دنیا کو منوّر کئے ہوئے ہیں ۔ حق کی وہ شمشیرِ برق تاب جس کی تجلّیوں نے دنیائے ایمان میں لازوال روشنی پیدا کر رکھی ہے ! یعنی مولا حسینؑ بن علیؑ !

حضرت امام حسینؑ نمازِ صبح ادا کر کے میدان میں تشریف لائے، تین دن کے بھوکے پیاسے لیکن نہ عزم میں لچک، نہ ہمّت میں کمی، نہ ابروئے شجاعت پر بل، نہ ذوقِ جہاد میں لغزش۔ ایمان فولاد سے زیادہ مستحکم، معرفت عرش سے زیادہ بلند، عزم پہاڑوں سے زیادہ سنگین، حق پر مر مٹنے کا جذبہ، آسمان کی پہنائیوں سے زیادہ وسیع، موت کی تمنّا، تمنائے دل عشاق سے زیادہ گہری، عشقِ الٰہی شمس و قمر سے زیادہ روشن و درخشاں، نس نس میں شوق و جہاد، نفس نفس میں ذوقِ بقائے باری، جسم کے ریشہ ریشہ میں معرفت و حق پرستی، خون کی ایک ایک بوند میں ایمان و یقین کے شرارے! حق پرستی کا ایک پہاڑ تھا جس سے طوفان ٹکرا رہے تھے، لیکن پہاڑ اپنی جگہ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ایمان کا ایک اتھاہ سمندر تھا، جس کی موجیں ساحل پر بکھرے ہوئے باطل کے کنکروں کو حقارت سے دیکھتی اور انسان پر قہقہے لگاتی گزرتی جا رہی تھیں۔ معرفت کا آفتاب تھا جو نصف النہار پر چمکتے ہوئے باطل کے ظلمت کدوں کی ہنسی اڑا رہا تھا۔ بزمِ عرش کی ایک روشن قندیل تھی جو شیطنیت کے اندھیروں کو اُجالوں میں تبدیل کرنے پر تُلی ہوئی تھی! ایثار، قربانی، شرافت، حلم، شجاعت، تدبّر، فداکاری اور عزم و عمل کا ایک دیوتا تھا جو کربلا کے میدان میں زندگی کو اس کی اعلیٰ ترین قدروں سے روشناس کرتے، انسانیت کو اس کے حقیقی شرف و منزلت سے ہمکنار کرنے اور بنی آدم کو فرشتوں سے افضل ثابت کرنے کا پورا پورا عزم کر چکا تھا۔ انسانیت کی روح عظیم تھی جو آج دنیا کو یہ دکھا دینا چاہتی تھی کہ انسان آدمؑ کی شکل میں اس قابل تھا کہ ملائکہ اسے سجدہ کریں، انسان نوحؑ کے پیکر میں اس کا مستحق تھا کہ

طوفان کی لہروں سے پار کر جائے، انسان حضرت ابراہیمؑ کے روپ میں اس لائق تھا کہ آگ اس کے لئے گلزار بن جائے، انسان حضرت موسیٰؑ کی صورت پر قادر تھا کہ حجاباتِ قدرت کو الٹ کے حسنِ الٰہی کو بے نقاب کر دے، انسان حضرت عیسیٰؑ کی شکل میں اس کا سزاوار تھا کہ چرخ چہارم اس کے لئے آنکھیں بچھا دے اور انسان حضرت محمدؐ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شکل میں اس کا حقدار تھا کہ ہفت افلاک اس کے قدموں تلے آجائیں، اس لئے کہ انسان حسینؑ کو پیدا کر سکتا ہے اور جو انسان حسینؑ بننے کے قابل ہے، وہ یقیناً اس قابل ہے کہ عرش و کرسی، آسمان اور زمین، جن و ملک، شمس و قمر، نجوم و کواکب، غرض یہ کہ کائنات کی ہر شے اس کی غلام رہ جائے!

حضرت امام حسینؑ کے ساتھ محض بہتر آدمی تھے، جن میں سے اگر کمر خمیدہ بوڑھوں اور نابالغ بچوں کو علیحدہ کر دیا جائے تو لڑائی کے قابل افراد کی تعداد ۳۵ سے زیادہ نہیں رہے گی۔ حضرت امام حسینؑ نے محض ۳۵ آدمیوں کی مدد سے پورے دن ۳۵ ہزار کے لشکر کا مقابلہ کیا اور تاریخیں بتلاتی ہیں کہ انہوں نے اس قیامت کی جنگ کی کہ دشمن کے کئی ہزار سپاہی تلوار کے گھاٹ اتر گئے۔ ۳۵ آدمیوں کا ۳۵ ہزار آہن پوش سپاہیوں سے مسلسل دس گھنٹے تک مقابلہ کرنا اور دشمن کے کئی ہزار سپاہیوں کو تہہِ تیغ کر دینا حضرت امام حسینؑ کی حربی مہارت کا ایک ایسا عالی شان ثبوت ہے، جس پر دنیا انگشت بدنداں رہ جاتی ہے اور غیر مسلم مؤرخین بھی اس حیرت انگیز شجاعت پر بارگاہِ حسینی میں عجیب المرتبت خراجِ عقیدت پیش کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

حضرت امام حسینؑ کوئی جنگ آزما سپاہی نہیں تھے۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے

اپنے والد کے ساتھ صفین کی جنگ میں شرکت کی تھی لیکن پھر بھی ان کو میدانِ جنگ کا بہت کم تجربہ تھا۔ ایسی حالت میں ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ کربلا کے میدان میں انہوں نے جو جنگ کی وہ کسی عام جرنیل یا فوجی ماہر کی جنگ نہیں تھی بلکہ ایک اللہ والے روحانی رہنما کی جنگ تھی۔ حضرت حسینؑ جرنیل نہیں تھے، روحانی رہنما تھے۔ حضرت حسینؑ زور و قوّت کا مجسّمہ نہیں تھے، روحانیت کا پیکر تھے۔ حضرت حسینؑ تلوار کے نبدے نہیں تھے، اللہ کے شیدائی تھے اور وہ کربلا کے بن میں یہ دکھا دینا چاہتے تھے کہ حقیقی طاقت دنیا دار سپاہیوں میں نہیں ہوا کرتی، حق کے متوالوں اور ایمان کے مجسّموں میں ہوا کرتی ہے۔ حق کے پرستار اگر خاموشی سے اپنی جانیں دے دیا کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ کمزور ہوتے ہیں، ناطاقت ہوتے ہیں، یا ان کے حریف ان کے مقابلہ میں زیادہ طاقتور ہوا کرتے ہیں — وہ جان دیتے ہیں تو اس لئے کہ وہ یہ جانتے ہیں کہ ان کی قربانی سے دنیا کی اصلاح ہو گی، انسانیت کو روشنی ملے گی، روحانی طاقت کو فروغ حاصل ہو گا اور ایمان کے چراغ کی لَو پاک خون کی آمیزش سے کچھ اور منوّر ہو جائے گی — اگر وہ جنگ پر تل جائیں تو ان میں اتنی طاقت موجود ہوتی ہے کہ زمین کو ہلا دیں، فولاد کے پنجے موڑ دیں اور شیروں کو پسپائی پر مجبور کر دیں۔ حضرت حسینؑ نے چاہا کہ تاریخ میں پہلی مرتبہ باطل پرست دنیا کو حق والوں کی ظاہری طاقت کا کرشمہ دکھا دیں، چنانچہ انہوں نے جہاں اپنی قربانی پیش کی، وہیں دنیا کو حق والوں اور روحانیت کے پرستاروں کی طاقت و قوّت کا تماشہ دکھانے کے لئے کچھ حد تک جنگ بھی کی۔ ایسی جنگ کہ آج ہم اس کی داستان پڑھتے ہیں تو ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی اور ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اگر امام حسینؑ نے واقعی قربانی دینے کا فیصلہ نہ کر لیا ہوتا، اگر امام حسینؑ یہ طے نہ کر چکے ہوتے انہیں کربلا میں شہید ہو جانا ہے اور اگر حسینؑ واقعی زندہ رہنے کے خواہش مند ہوتے تو جنگ کا نتیجہ بالکل برعکس نکلتا اور سورماؤں کی وہ مختصر سی جماعت جو حسینؑ نے کربلا کے میدان میں اتاری تھی کوفہ اور

دمشق پر بھی اپنی فتح کے پرچم لہرا دیتی !

حضرت امام حسینؑ تین دن کے بھوکے پیاسے تھے۔ صبح سے شام تک عزیزوں اور دوستوں کے داغ کلیجہ پہ سہتے رہے۔ کڑیل جوان بیٹا نگاہوں کے سامنے مارا گیا۔ برابر کے بھائی خاک و خون میں تڑپے، علی اصغرؑ ہاتھوں پہ شہید ہو گئے۔ قاسمؑ کی نعش گھوڑوں سے روندی گئی۔ حبیب، مسلم و زہیر کے سے ساتھی مار ڈالے گئے لیکن حضرت امام حسینؑ کے دل کی طاقت نے جواب نہیں دیا۔ جب علی اصغرؑ بھی دنیا میں باقی نہ رہے تو حضرت حسینؑ خیمہ میں داخل ہوئے۔ بہنوں سے وداع ہوئے، بیمار بیٹے سے گلے ملے اور باہر تشریف لائے۔ گھوڑے پر سوار ہو کر میدان میں پہنچے، تن تنہا حسینؑ دن بھر تیر اور تلوار کے زخم کھاتے ہوئے، زخمی، مجروح اور بھوک سے نڈھال، سامنے ہزاروں عرب شہسواروں کا لشکر، سینکڑوں تلواریں خون پینے کے لئے تیار، نیاموں سے ابلے ہوئے ہزاروں نیزے جگر سے پار ہو جانے کے لئے تیار اور بے چین۔ لاکھوں تیر جسم کو چھلنی کر ڈالنے کے لئے ترکشوں سے باہر، ایک طرف ہزاروں اور دوسری طرف اکیلے حسینؑ !۔ ہزاروں ظالموں کا ایک مظلوم سے مقابلہ، ہزاروں تیغ زنوں کی ایک مصیبت زدہ سے جنگ، ہزاروں باطل پرستوں کا ایک حق پرست سے مجاہدہ ـــ حضرت امام حسینؑ نے لڑنا شروع کیا، نہیں، حق نے لڑنا شروع کیا، ایمان نے لڑنا شروع کیا۔ خدا پرستی نے لڑنا شروع کیا۔ انسانیت و حقانیت نے لڑنا شروع کیا۔ ظلم کے مقابلے میں مظلومیّت نے لڑنا شروع کیا۔ دنیاداری کے مقابلہ میں دینداری نے لڑنا شروع کیا۔ شیطان کے مقابلہ میں روحانیت کے علمبردار نے لڑنا شروع کیا ـــ اور اس لڑائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۳۵ ہزار کا لشکر تہہ و بالا ہو گیا، تقریباً دو ہزار آدمی موت کے گھاٹ

اُتر گئے ، بقیۃ السیف بھاگ کھڑے ہوئے ، حسینؑ تعاقب کر رہے ہیں ، یزید کے سپاہی بھاگ رہے ہیں اور دنیا یہ کرشمہ دیکھ رہی ہے کہ حق کا اگر ایک سپاہی بھی تلوار اٹھالے تو روحانیت اس کے بازوؤں میں وہ کس بل عطا کر دیتی ہے ۔ اس کی تلوار میں ایسی کاٹ پیدا کر دیتی ہے ، اور اس کے حملوں میں وہ طوفانی قوتیں ابھار دیتی ہے کہ ۳۵ ہزار سپاہی اس کے سامنے سے بھاگ کھڑے ہوئے ہیں

حسینؑ نے تھوڑی دیر تک روحانیت و حقانیت کے علمبردار سپاہی کی طاقت اور سپہ گری کا مظاہرہ کیا ـــــــ لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حسینؑ کا مقصد جنگ جیتنا یا زندہ رہنے کا نہیں تھا ، حسینؑ یہ جانتے تھے کہ حق کو اُن کی زندگی کی نہیں ، اُن کی موت کی ضرورت ہے ۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ آج کی جنگ میں کامیابی یہی ہے کہ وہ مر جائیں اور اپنے خون سے حقانیت کی کھیتی کو سرسبز و شاداب کر جائیں ، ان کو معلوم تھا کہ حق کی حیات ان کی موت پر منحصر ہے ، وہ کربلا میں قربانی دینے آئے تھے ، مرنے آئے تھے ، جنگ جیتنے نہیں آئے تھے ، اس لیے جب وہ حق پرستوں کی جنگ کے سارے انداز دنیا پر واضح کر چکے تو انھوں نے اپنے مقصد اصلی یعنی شہادت کی تکمیل کا فیصلہ کیا ، تلوار نیام میں رکھ لی ، جنگ بند کر دی اور میدان میں خاموش کھڑے ہو گئے ، بھاگتے ہوئے دشمنوں نے جب یہ

انداز دیکھا تو پلٹے ، لیکن خوف غالب تھا ، اس لیے قریب آنے کی جرأت نہیں کر سکے ، ان کو اندیشہ تھا کہ اگر ہم قریب گئے تو حسینؑ کی تیغ بے اماں پھر نیام سے باہر آجائے گی اور جان بچانا محال ہو گا ——— لیکن وہ غلطی پر تھے ! حسینؑ اب لڑنا نہیں چاہتے تھے مرنا چاہتے تھے ، انھوں نے خوب سوچ سمجھ کے تلوار نیام میں رکھی تھی ، وہ اب تلوار کو بے نیام کرنے کو تیار نہیں تھے ، دشمن نے دُور سے تیروں کی بارش شروع کی ، حسینؑ نے کوئی مدافعت نہیں کی ، سارا جسم تیروں سے غربال ہو گیا ۔ سر سے پیر تک تیر ہی تیر نظر آنے لگے ، اب دشمن کا اعتماد بڑھا تو پشت کی جانب سے چند سپاہی حسینؑ کے قریب آئے ، تلواریں برسنا شروع ہوئیں ۔ جسم کے پُرزے اُڑنے لگے ، گوشت کٹ کٹ زمین پر گرنے لگا ، لیکن خاموش رہے ، زخم کھاتے رہے ، اور صبر کا مظاہرہ کرتے رہے ، آخر ایک ظالم نے پشت پر نیزہ مارا ، جس سے حسینؑ زمین پر آرہے ، لیکن جسم میں اتنے تیر پیوست تھے کہ آپ کا جسم زمین سے مس نہیں ہوا ۔ بلکہ آپ تیروں پر معلق رہے ! ——— عجیب دردناک منظر ہو گا یہ بھی !

چاروں طرف شمشیر بکف دشمن ، خون کے پیاسے یزیدی سپاہی ، اور بیچ میں مظلومیت کا ایک مجروح اور درد رسیدہ مجسّمہ ، لیکن یہ حسینؑ تھے ۔ حق کے سپاہی اور عشق الٰہی کے پیکر ، اس وقت بھی جبکہ موت کا فرشتہ ان کے ارد گرد منڈلا رہا تھا ، ان کی جبینِ ہمت پر کوئی شکن نظر نہیں آتی تھی ۔ ان کا عزم سالم تھا اور ان کا ذوقِ شہادت

سکے، وہ اب بھی خوف زدہ یا مرعوب ہونے پر تیار نہیں تھے، ان کے سکون و طمانیت کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے اس خوف و دہشت کے عالم میں بھی کربلا کی تپتی ہوئی ریتی سے تیمّم کیا اور تلواروں کی چھاؤں میں نماز ادا کرنے میں مصروف ہو گئے ـــ

ادھر پرماتما کا یہ سچا پریمی عبادت میں مصروف ہوا ادھر دشمن کو اپنے ناپاک ارادے پورے کرنے کا موقعہ ملا۔ حسینؑ سجدہ میں تھے کہ شمر آپ کی پشت پر سوار ہو گیا اور چاہتا تھا کہ آپ کو ذبح کر ڈالے اس نے دیکھا کہ آپ کے ہونٹ جیسے ہل رہے ہیں اسے خیال گذرا کہ شاید آپ اپنے دشمنوں کے حق میں بد دعا کر رہے ہوں گے۔ چنانچہ وہ اپنا کان آپ کے ہونٹوں کے قریب لے گیا لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے سُنا کہ حق کا یہ عازم موت جرنیل اپنے رب سے یہ عرض کرتا ہے:

"خداوندا! میں نے اپنا فرض پورا کیا، اب تو اپنا وعدہ
پورا کر اور میرے نانا کی گنہ گار امت کو بخش دے!"

یہ آخری دعا تھی جو حسینؑ کے لبوں سے ادا ہو رہی تھی! شمر نے یہ جملہ سنا اور پشت گردن سے خنجر پھیر دیا، حسینؑ قتل ہو گئے، آپ کے قتل ہوتے ہی جیسے قیامت آ گئی - سیاہ آندھیاں چلنے لگیں، زمین ہچکولے لینے لگی - چاروں طرف اندھیرا چھا گیا اور آسمان سے خون کی بارش شروع ہو گئی ـــ تھوڑی دیر تک یہی کیفیت رہی اس کے بعد جب سکون ہوا تو عمر سعد نے یہ حکم دیا کہ آپ کی نعش پامال سُم اسپاں کر دی جائے چنانچہ آپ کی لاش پر گھوڑے دوڑا دیے گئے اور اس طرح ایک حق پرست مجاہد خاک و خون میں ملا دیا گیا جس کی نظیر تاریخ عالم میں ملنا محال ہے جس نے اپنے پاک اور مقدس لہو سے ایمان کی

نیستی ہری کر دی۔ جس کی شاندار قربانی نے بنی آدم کا سر فرشتوں کے مقابلہ میں اونچا کر دیا اور جس کا نام آج بھی حق پرستوں کے دلوں میں وہ آہنی عزم اور وہ فولادی ہمت پیدا کر دیتا ہے جس سے باطل کے سخت سے سخت طوفان بھی ٹکراتے ہیں تو پسپائی پر مجبور ہو جاتے ہیں!

میں نے حسینؑ کو کربلا کے بوڑھوں میں شمار کیا ہے حالانکہ خود میرا ضمیر مجھے اس کی اجازت نہیں دے رہا ہے کہ میں حسینؑ کو بوڑھا قرار دوں ——— حقیقت یہ ہے کہ حسینؑ کے بڑھاپے پر خود جوانی نثار ہے، جوانوں میں بھی وہ کس بل، ارادوں کی وہ پختگی، عزائم کی وہ بلندی، قربانیوں کا وہ ذوق، فدائیت کا وہ جذبہ، ایثار کی وہ کیفیت، شجاعت کا وہ زور، اور ہمت کی وہ بلندی آج تک نہیں دیکھی گئی جو اس ۵۷ سال کے "بوڑھے" میں تھی، اسے سن و سال کے اعتبار سے "بوڑھا" کہا جا سکتا ہے، لیکن صفات کے اعتبار سے اسے جوانوں پر فوقیت حاصل ہے ——— اور کیوں نہ ہو؟ آخر انہیں جواں صفات ہی کی بدولت پیغمبرؐ اسلام نے انھیں جنت کے جوانوں کا سردار قرار دیا ہے! اور کربلا کے میدان میں حسینؑ نے یہ ثابت کر دیا کہ واقعی آپ اس خطاب کے پورے طور پر مستحق ہیں! ——— اگر جنت کا کوئی وجود ہے اور اگر یہ حقیقت ہے کہ حق پرست اور نیکوکار انسان جنت میں جائیں گے تو مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ حسینؑ ان جنت نواسیوں کے سردار ہوں گے اور یہ سرداری کوئی "عطیہ" یا "نوازش" نہیں ہو گی بلکہ ان کی صلاحیت اور ان کی قربانی کی قیمت ہو گی ——— حسینؑ نے اپنے خون سے جنت کی سرداری خریدی ہے، یہ ان کا حق ہے، وہ اس کے اہل ہیں اور مجھے یقین ہے کہ دنیا کے تمام مجاہدین حق ان کی سرداری کو اپنے لیے موجب فخر اور سرمایۂ امتیاز تصور کرتے ہوئے بخوشی اسے قبول فرمائیں گے!

شہادت کے بعد

حسینؑ شہید ہو گئے ، یزیدی لشکر نے بظاہر جنگ جیت لی ۔ حق کے مجاہد اعظم کی نعش گھوڑوں سے پامال کرادی گئی ، خیمہ جلا دیے گئے ، مال و اسباب لوٹ لیا گیا ، عورتوں اور بچوں کو قید کر لیا گیا اور عاشور کے دوسرے روز یزیدی فوج ، حسینؑ اور انصار حسینؑ کی لاشوں کو بے دفن و کفن چھوڑ کے کوفہ روانہ ہو گئی ۔ آگے آگے شہیدوں کے سر نوک نیزہ پر بلند، پیچھے پیچھے برہنہ سر و بے نقاب سیدانیاں رسیوں میں جکڑی ہوئی ، فتح کے شادیانے بجتے ہوئے کامیابی کی مسرتیں چہروں سے عیاں ——— لیکن قسمت کا فیصلہ کچھ اور ہی تھا ، قدرت ظالموں کی بے خبری پر مسکرا رہی تھی ، اور انتقام کا خوفناک سایہ عراق کی سرزمین پر پڑنا شروع ہو گیا تھا !

حسینؑ نے اتنی بڑی ، اتنی خوفناک اور اتنی دردناک جنگ اس لیے نہیں لڑی تھی کہ دشمن اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے ۔ اور رسولؐ کا گھرانا شکست کھا جائے ! حسینؑ علیؑ کے بیٹے تھے ! اس علیؑ کے بیٹے جس نے کبھی جنگ نہیں ہاری ، حسینؑ بھی جنگ میں ہارنا نہیں جانتے تھے ، انھوں نے جنگ اس لیے لڑی تھی کہ فتح حاصل کریں ، دائمی اور ابدی فتح ، مکمل اور فیصلہ کن فتح ، ایسی فتح جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو ، ایسی فتح جسے ساری دنیا تسلیم کرلے ، ایسی فتح جو کبھی شکست میں تبدیل نہ کی جا سکے ——— یہ اور بات ہے کہ علیؑ کی فتح کا انداز یہ تھا کہ

دشمن کا سر کاٹ دیا جائے اور حسینؑ کی فتح کے تیور یہ تھے کہ خود اپنا سر دشمن کو پیش کر دیا جائے ، دنیا کی تاریخ میں اس انداز کی فتح نہیں دیکھی گئی تھی اس لیے دشمن نے اسے شکست سے تعبیر کیا ، لیکن بعد کے حالات نے یہ ثابت کر دیا کہ :

حسینؑ فاتح تھے اور یزید مفتوح ، حسینؑ اپنے مقصد میں کامیاب تھے اور یزید اپنے مقاصد میں ناکام !

یزیدی لشکر فتح کے زعم میں سرشار کوفہ میں داخل ہوا سارے شہر کو فاتح لشکر کے استقبال کے لیے دلہن کی طرح سجایا گیا ، بازاروں میں سُرخ پرچم لہرا رہے تھے ، سڑکوں پر عوام کا جماؤ تھا لوگوں نے دیکھا کہ اُن کے سامنے سے کچھ سر گزرے ، پھر سپاہی تلوار سونتے ، برچھیاں تانے لچکتی ہوئی کمانیں کاندھوں پر ڈالے ، ترکشوں میں چمچاتے ہوئے تیر سجائے صفیں باندھے ، عسکری ٹھاٹھ باٹ دکھاتے گذرے اور آخر میں کچھ اونٹ سامنے آئے ، بے کجاوہ ، بے عماری ، ان پر چند بے کس اور قیدی عورتیں ، ایک اونٹ پر ایک بیمار نوجوان ، ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنے گلے میں دو من وزنی خاردار طوق ، زنجیروں سے جکڑا ہوا خاموش ، نحیف اور ناچار ، کوفہ والے ان قیدیوں کو دیکھ کر مسکرائے ، فاتحانہ مسکراہٹ اور طنز آمیز تبسّم ، اچانک ایک بوڑھی عورت کھڑی ہو گئی اور اس نے تقریر شروع کر دی ، دل ہلا دینے والی تقریر ، ایسی تقریر جس نے کوفہ والوں کو اپنی خطاؤں پر پشیمانی محسوس کرنے پر مجبور کر دیا ، جس نے یزیدی ریاست کے تار پود بکھیر دیے ، جس نے حسینؑ کی حقانیت کو عالم آشکارا کر دیا ، اور جس نے دولت کے دیوانے ، دنیا پرست اور باطل نواز کوفیوں کی نگاہوں کے سامنے ان کی عاقبت کا نقشہ پوری وضاحت کے ساتھ کھینچ دیا ، مسکراتا ہوا مجمع پہلے تو سنجیدہ بنا ، پھر آنکھوں میں آنسو

جھلکے اور تقریر کے خاتمہ پر اشک و آہ کا طوفان امنڈ پڑا۔ چاروں طرف سے رونے کی صدائیں بلند ہو گئیں، فتح کے شادیانے ماتم کی آوازوں میں تبدیل ہو گئے، مردہ ضمیروں میں زندگی کی لہر دوڑنے لگی اور سویا ہوا کوفہ جاگنا شروع ہو گیا عمر سعد نے موقع کی نزاکت کو سمجھا، لشکر کو حکم دیا کہ قیدیوں کو فوراً دارالامارہ میں لے جاؤ۔ چنانچہ شہیدوں کے سر اور قیدیوں کا قافلہ دارالامارہ پہنچا دیا گیا، یہاں دربار سجا ہوا تھا، ابن زیاد تختِ حکومت پر پھولا نہیں سماتا تھا، خوشامدیوں کا چاروں طرف ہجوم تھا، لوگ فتح کی مبارکبادیں دے رہے تھے اچانک شہیدوں کے سر دربار میں داخل ہوئے اور سونے چاندی کی کشتیوں میں گورنر عراق کے سامنے پیش کئے گئے، ابن زیاد کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی اس نے پہلے تو حسینؑ کے سر سے گستاخیاں کیں اور پھر قیدیوں کی جانب متوجہ ہوا، اسے یقین تھا کہ ان عورتوں کی ہمت ٹوٹ چکی ہو گی اور ان میں جواب دینے کی کوئی سکت باقی نہیں ہو گی۔ چنانچہ اس نے شیرِ خدا کی بیٹی کو مخاطب کر کے کہا،

"زینبؑ! تم نے دیکھا کہ خدا نے تمہارے بھائی کے ساتھ کیا سلوک کیا؟"

ابن زیاد کا مقصد تھا اپنی طاقت ظاہر کرنا، عوام پر اپنا رعب قائم کرنا، حسینؑ اور آلِ رسولؐ کو نگاہوں سے گرانا اور یزید کی خلافت ثابت کرنا، اسے یقین تھا کہ زینبؑ اس ہولناک قتل و غارت کے نتیجہ میں اس درجہ خوف زدہ ہوں گی کہ وہ دشمن کے بھرے دربار میں کوئی جواب دینے کی جرأت نہیں کر سکیں گی۔ لیکن شیر دل حسینؑ کی شیر دل بہن نے فوراً جواب دیا۔

"خدا کا شکر ہے کہ اس نے میرے نانا کو نبوّت اور میرے بھائی کو شہادت سے سرفراز کیا، اے ابن زیاد تو نے جو مظالم ڈھائے ہیں اس کے لیے قیامت کے دن سزا پر تیار ہو جا؟"

زینبؑ نے ابن زیاد کو ایسے دنداں شکن جواب دیے کہ اس کا سر پھر گیا اور

اہالیان دربار پر بھی حسینؑ کی حقانیت ویسی ہی آشکار ہوگئی، جیسی کہ اہالیانِ کوفہ پر واضح ہوچکی تھی چنانچہ بغاوت کے آثار رونما ہونا شروع ہوئے۔ چند محترم رؤسائے کوفہ نے جو دربار میں موجود تھے، کھلم کھلا ابن زیاد کی مخالفت کی!

ابن زیاد نے ان لوگوں کو قتل کرادیا تاکہ عوام مرعوب اور خوفزدہ ہوجائیں، بغاوت کے جذبات دب جائیں اور تشدد کے بل پر امن قائم کرلیا جائے لیکن یہ اس کی غلطی تھی، زینبؑ اور ام کلثومؑ کی تقریروں اور حسینؑ کی شہادت نے جو آگ بھڑکائی تھی اسے تلوار کے پانی سے بجھانا محال تھا، چنانچہ محض تین ہی دن میں ابن زیاد کو حقیقت حال معلوم ہوگئی اور اس نے یہ سمجھ لیا کہ اب اگر آلِ رسولؐ کے قیدی دو چار روز بھی کوفہ میں ٹھہر گئے تو عمومی بغاوت ہوجانا یقینی ہے۔ ایسی حالت میں اس نے شہیدوں کے سروں اور قیدیوں کو لشکر کے ہمراہ شام روانہ کردیا کیونکہ اسے یقین تھا کہ شامی آلِ رسولؐ کے کٹّر دشمن ہیں۔ اور اگر یہ قیدی وہاں رکھے گئے تو سلطنت کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکے گا! یہ بھی ابن زیاد کی بھول تھی، اسے نہ تو قدرت کے قانونِ انتقام کا علم تھا، اور نہ حسینؑ کی عجیب وغریب جنگ کی اطلاع چنانچہ بعد کے واقعات نے اس کی لاعلمی کو پوری طرح ظاہر کردیا۔ اور دنیا نے یہ دیکھ لیا کہ حسینؑ کے قتل کی جو خوشیاں منائی جارہی تھیں وہ کس طرح محض چند ہی ماہ کے بعد ماتم کے سیلاب میں ہمیشہ کے لیے غرق ہوگئیں!

یزیدی لشکر کوفہ سے دمشق روانہ ہوا، راستہ میں رہنے والے تمام تر وہی لوگ تھے جو یزید کی بیعت کرچکے تھے، جو اسے خلیفہ تسلیم کرتے تھے، جو باطل کے جال میں پورے طور پر پھنسے ہوئے تھے اور جنھوں نے حق اور ایمانداری پر دنیاداری کو ترجیح دے رکھی تھی ——— ایسی حالت میں یزیدی فوج کی یہ توقع بے جا نہیں تھی کہ ہر منزل پر اس کا شاہانہ استقبال کیا جائے گا، لوگ اس کی راہ میں آنکھیں بچھائیں گے اور آلِ رسولؐ کی بربادی پر ہر جگہ خوشی کے ترانے بلند

کیے جائیں گے ، لیکن شہیدوں کا خون اپنا کام کر چکا تھا حسینؑ اب قدم قدم پر یزید کو شکست دینے پر تُلے ہوئے تھے ، حسینی لشکر کی کمانڈر "زینبؑ" دشمن کو اب سکون کا ایک لمحہ بھی نہیں دینا چاہتی تھیں چنانچہ کوفہ سے لے کر شام تک جہاں بھی لشکر یزید پہنچا ، وہاں بغاوت کے شرارے بھڑک اُٹھے ہر منزل پر ایک نئی جنگ ہوئی اور یزیدیوں کو ایک دو نہیں پورے اٹھارہ مقامات پر شکست کا سامنا کرنا پڑا ، آخر یہ لشکر لڑتا بھڑتا ، بلکہ بھاگتا بھاگتا ، دمشق پہنچا ، لیکن یہاں بھی قدرت گھات میں تھی ، حسینؑ خود دشمن کے قلب میں گھُس کے اسے شکست دینے پر تلے ہوئے تھے اور ان کا یہ فیصلہ تھا کہ اسی شام میں جہاں یزید کا طوطی بولتا تھا ، جہاں معاویہؓ کے نام کا کلمہ پڑھا جاتا تھا ، جہاں منبروں پر علیؑ ، حسنؑ اور حسینؑ پر سب و شتم کیا جاتا تھا ، جہاں آلِ رسولؐ کی دشمنی جزوِ ایمان تصوّر کی جاتی تھی ، یزید کو ایسی قیامت خیز شکست دی جائے کہ اس کا نام و نشان تک فنا ہو جائے ۔ یزید مرے تو اس کی قبر کا بھی کسی کو پتہ نہ چلے اور میری حقانیت اس شان سے واضح ہو کہ تیرہ سو سال بعد بھی لوگ اس غرض سے شام جائیں کہ وہاں حسینؑ کے عزیزوں کے چند مزارات ہیں جن کی زیارت ایمان کو تازہ کرنے اور حق و صداقت کو حیات جاوید عطا کرنے میں معاون ہوا کرتی ہے !

یزید نے دمشق کی آئینہ بزی کرائی شہر سجایا گیا اور جب لشکر شہیدوں کے سر اور قیدیوں کا قافلہ بے شہر میں داخل ہوا تو اس کا شاندار استقبال کیا گیا ۔ یزید نے یہ پروپیگنڈا کر رکھا تھا کہ سلطنت اسلامی پر ترک کافروں نے حملہ کیا تھا جنھیں شکست دے کر قیدی بنا لیا گیا ہے ۔ چنانچہ ہزاروں آدمی ان "ترک کافروں" کو دیکھنے کے لیے سڑکوں پر موجود تھے ، فتح کی خوشی میں ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے ، نئے نئے لباس جسموں پر جگمگا رہے تھے اور کوٹھوں پر عورتیں بھی قیدیوں کا تماشہ دیکھنے کے لیے موجود تھیں ۔ لشکر داخل ہوا تو لوگوں

نے دیکھا کہ آگے آگے چند سر ہیں جو نیزوں پر بلند ہیں ؟ ترکوں کے نہیں ہاشمی عربوں کے سر جن کی زلفیں گرد آلود تھیں ـــــ ان کے عقب میں چند عورتیں ہیں ، بے بس اور اسیر عورتیں ، لوگ ان "ترک" عورتوں کے حال زار پر ہنسنے اور آوازیں کسنے لگے ، اچانک تین عورتیں اونٹوں کو روک کر کھڑی ہوئیں ، زینبؑ ، ام کلثومؑ اور فاطمۂ کبریٰ ، ہزاروں آدمیوں کا مجمع سناٹے میں آگیا ، سب کو یہ خیال ہوا کہ دیکھیں یہ "باندیاں" کیا کہتی ہیں ، لوگوں کا خیال تھا کہ یہ ترکی زبان میں اپنی بے بسی کا نوحہ کرتے ہوئے رہائی کی بھیک طلب کریں گی ۔ لیکن ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انھوں نے دیکھا کہ عورتیں عربی بول رہی ہیں اور عربی بھی قریشی اور ہاشمی لہجہ میں ، جیسے یہ مدینہ کی رہنے والیاں ہوں ! اب تو سارا مجمع گوش برآواز ہوگیا ، محترم خواتین نے شامیوں کو بتلایا کہ ہم رسول زادیاں ہیں ، یزید نے ہمارے مردوں کو قتل کر دیا ہے اور خانوادۂ رسالت کی عورتوں کو گرفتار کرکے ان کی تشہیر کر رہا ہے ، اس نے ناحق آلِ رسولؐ کا خون بہایا ہے اور اب پیغمبرؐ اسلام کی ذریّت کو ذلیل کرنے پر تلا ہوا ہے ! ـــــ اس اعلان کا ہونا تھا کہ مجمع میں ہل چل مچ گئی ، لوگوں نے رونا شروع کر دیا اور وہی دمشق جو مسرتوں کا گہوارہ بنا ہوا تھا غم و الم کی بدلیوں میں روپوش ہوگیا ۔

لشکر آگے بڑھا تو حسینؑ کے بیمار فرزند علی بن الحسینؑ نے شامیوں پر حقیقت حال کھولنا شروع کی ، اور ایسی قیامت خیز تقریر کی جس سے پتھر کا کلیجہ بھی موم ہوجائے ، لوگ کھلم کھلا یزید پر نفرین کرنے لگے اور حسینؑ کا آفتاب خود دشمن کے دارالحکومت میں اس شان سے چمکنے لگا کہ اس کی روشنی سے دمشقیوں کے دلوں کی ظلمت بڑی حد تک کافور ہوگئی ۔

قیدیوں کا قافلہ دارالامارہ شاہی میں حاضر ہوا ۔ شہدا کے سر یزید کے سامنے پیش کیے گئے اور سات سو کرسی نشینوں کے مجمع میں آلِ رسولؐ کو باندیوں

کی شکل میں کھڑا کر دیا گیا۔ یزید اس وقت شراب خوری میں مصروف تھا اور ساتھ ساتھ شطرنج بھی کھیلتا جا رہا تھا، اسے طاقت کا غرور تھا اور حکومت کا نشہ، وہ خوش تھا کہ اس نے حسینؑ کو قتل کر کے اپنی راہ سے آخری کانٹا بھی دور کر دیا ہے اور اس کی مخمور آنکھیں یہ دیکھنے سے قاصر تھیں کہ حسینؑ نے اپنی گردن کٹا کے آلِ رسولؐ کے لیے شام میں داخلہ کا موقع حاصل کر لیا ہے، حسینؑ کا فرزند حقانیت و صداقت کے حربوں سے مسلح ہو کر یزیدیت کا خاتمہ کرنے خود اس کے دربار تک میں گھس آیا ہے! اور اب اس فیصلہ کن جنگ کی آخری گھڑیاں آگئی ہیں، جو صفین اور کربلا میں ناتمام رہی تھی، جسے علیؑ اور حسینؑ نے اپنے مخصوص مصالح کے پیش نظر ظاہری کامیابی تک پہنچانے سے گریز کیا تھا۔ اور جسے اب علی بن حسینؑ اس شان سے فتح تک پہنچانے والے ہیں کہ اس فتح کی گونج قیامت تک ساری دُنیا میں سُنی جائے گی۔

یزید مے نوشی میں مصروف تھا اور علی بن حسینؑ اس تصوّر سے مسرور ہو رہے تھے کہ جس مملکتِ شام میں ان کے دادا علیؑ، چچا حسنؑ، اور والد حسینؑ داخل نہیں ہو سکے اس میں داخل ہو کر دشمن کو فیصلہ کن شکست دینے کی سعادت ان کے حصّہ میں آئی ہے، علی بن حسینؑ خوب جانتے تھے کہ اب فتح کا پرچم ان کے ہاتھوں میں ہے اور وقت آگیا ہے جب اُن کو دشمن پر وار شروع کر دینا چاہیے ——— چنانچہ آپ نے خود ہی یزید کو مخاطب کیا۔ اندھے اور بدمست یزید کو، اس یزید کو جو اب تک اپنی فتح کے جھوٹے خواب دیکھ رہا تھا، یزید نے پورے اعتماد کے ساتھ گفتگو شروع کی، اسے یقین تھا کہ اس کے دارالحکومت میں، اس کے لشکر کی موجودگی میں، ایک بیمار اور ناتواں قیدی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا لیکن محض چند ہی لمحات میں اس نے دیکھا کہ بازی اُلٹ چکی ہے، وہ

مات کھا رہا ہے ، درباریوں کے تیور کچھ اور ہو چکے ہیں ، اب میدان علی بن حسینؑ کے ہاتھ ہے ، وہ گھبرا گیا ، حکومت ، دولت اور شراب کا مشترکہ نشہ کافور ہونے لگا ، اور اس نے شکست سے بچنے کے لیے یہ تدبیر کی کہ فوراً قیدیوں کو دربار سے قید خانہ میں بھیج دیا تاکہ فیصلہ سے قبل کچھ مہلت مل جائے اور وہ اس شرمناک شکست سے محفوظ رہ سکے جو اُسے علی بن حسینؑ کے ہاتھوں صاف اور غیر مبہم طریق پر نظر آنے لگی تھی!

اب یزید اور حسینؑ کے جانشین میں جنگ شروع ہوئی ، طولانی اور صبر آزما جنگ ، سرد اعصابی جنگ - جس میں یزید کی حیثیت وہ نہیں تھی جو اسے کربلا میں حاصل تھی ، کربلا میں یزید کا لشکر اقدام کرتا تھا اور حسینؑ محض دفاع پر مجبور تھے لیکن اب صورت بدل چکی تھی - اب یزید خود مدافعانہ جنگ لڑنے پر مجبور تھا ، غنیم اس کے تمام مورچے توڑنے کے بعد خود اس کے دار الحکومت میں ، بلکہ اس کے محل کی دیواروں کے نیچے موجود تھا اور ایسے قیامت خیز حملے کر رہا تھا جن کی تاب لانا اموی شہزادہ کے لیے محال تھا ، عالم یہ ہو چکا تھا کہ بھرے درباروں میں ، جامع مسجد میں ، حتیٰ کہ خود راج محل میں یزید کو منہ دکھانا محال کر دیا گیا تھا ، علی ابن الحسینؑ کے شیرانہ نعروں اور حق پرستانہ تقریروں سے پورا دمشق گونج رہا تھا اور یزید میں یا اس کے ہوا خواہوں میں اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ وہ کوئی جواب دے سکیں ، یہاں تک کہ ایک دن وہ آگیا جب یزید نے "شکست" سے بچنے کے لیے بادشاہوں کی پرانی چال کھیلی اور یہ اعلان کیا کہ :

> " خدا ابن زیاد پر لعنت کرے کہ اس نے حسینؑ کو قتل کر دیا میرا ہرگز منشاء نہیں تھا کہ حسینؑ کے ساتھ ایسا سلوک کیا جائے ! "

یزید کو امید تھی کہ اس کے اس جھوٹ سے علی ابن الحسینؑ مطمئن ہو جائیں

گے ، عوام کی بغاوت فرو ہو جائے گی ، بھڑکتی ہوئی آگ بجھ جائے گی اور وہ اسی طرح علیؑ کے پوتے کو دھوکا دے کر شکست سے بچ جائے گا جس طرح اس کے باپ نے میدانِ صفین میں نیزوں پر قرآن بلند کرنے کی کھلی ہوئی مکاری کے ذریعہ علیؑ کے ہاتھوں شرمناک شکست سے اپنے آپ کو بچا لیا تھا۔ لیکن اب نہ صفین کا میدان تھا اور نہ علیؑ کے لشکر کے ڈھل مل یقین سپاہی ! علیؑ بن الحسینؑ اپنے دادا کے تجربہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے ساتھ وہ سپاہی لائے تھے جو حق میں ڈوبے ہوئے تھے ، جن کو اموی ڈپلومیسی کسی حالت میں دھوکا نہیں دے سکتی تھی ، جو یزید کے مکر کا شکار ہونے پر کسی طرح تیار نہیں تھے ، جن میں کسی اندرونی خلفشار یا خانہ جنگی کا کوئی امکان نہیں تھا چنانچہ یزید کی یہ چال بھی ناکام ہوئی ، علیؑ بن الحسینؑ وار پر وار کرتے رہے اور آخر یزید اس نوبت کو پہنچ گیا کہ اپنے منہ پر خود ہی طمانچے مارتا تھا اور رو رو کے کہتا تھا ــــ " ہائے ! میں نے حسینؑ کو کیوں قتل کرا دیا ! "

یزید کا یہ ماتم اس لیے نہیں تھا کہ اسے شہادت حسینؑ پر کوئی ندامت تھی بلکہ وہ اس لیے روتا تھا کہ وہ دیکھ رہا تھا کہ حسینؑ نے اسے فیصلہ کن شکست دے دی ہے ، وہ قطعاً مات کھا چکا ہے ، اس نے اور اس کے باپ نے اسلام کو مٹا دینے کا جو منصوبہ بنایا تھا ، اسے حسینؑ نے اپنے خون سے مثل حرفِ غلط مٹا دیا ہے ، اس کی سلطنت متزلزل ہو چکی ہے اس کی طاقت کا دیوالہ نکل چکا ہے اور جس حکومت کی خاطر اس نے آلِ رسولؐ کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے ہیں ، وہ حکومت اب ختم ہوتی نظر آ رہی ہے !

یزید نے ایک سال تک یہ کوشش کی کہ شکست سے بچ جائے اور حکومت کا بھرم قائم رہ جائے لیکن حسینی لشکر کا سپہ سالار اور علی مرتضیٰ

کا ہمنام علی بن الحسینؑ، اب صفین کی مثال دہرانے اور جنگ کو غیر فیصلہ کن حالت میں ختم کر دینے پر تیار نہیں تھا، یزید وقت سے کھیل رہا تھا اور آخری نتیجہ کے اعلان میں زیادہ سے زیادہ تاخیر پیدا کرنا چاہتا تھا، علی ابن الحسینؑ بھی اس صورتِ حال کو خوب سمجھتے تھے لیکن وہ اعصابی جنگ کے ایک ماہر کی حیثیت سے یزیدی سیاست کو مات دینا خوب جانتے تھے، یزید اعتراف شکست میں جتنی تاخیر کرتا جا رہا تھا، حریف اس تاخیر سے اتنا ہی فائدہ اٹھاتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ آخر یزید کو یہ سمجھ لینا پڑا کہ یہ تدبیر بھی کارگر نہیں ہوگی، علی مرتضیٰؑ کے مقابلے میں معاویہ نے جنگ کو طول دے کر جو کامیابی حاصل کر لی تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ علیؑ کے ساتھی ایمانی حیثیت سے کمزور تھے، ان کو رشوتیں دے کر خریدا جا سکتا تھا، جنگ کو طول دے کر تھکایا جا سکتا تھا، ایک خالص اصولی جنگ سے جس میں کسی ظاہری یا مادی فائدہ کی امید نہ تھی ان کو بددل کیا جا سکتا تھا۔ لیکن علی ابن حسینؑ کے ساتھ یہ معاملہ نہیں تھا ان کے ساتھ جو لشکر تھا (یعنی چند قیدی اور چند بے بس بچے)! وہ ان کامل الایمان حق پرستوں پر مشتمل تھا جو حسین کے فیض تربیت سے آراستہ تھے، ایسی حالت میں یزید جوں جوں تاخیر کرتا رہا، توں توں علی بن الحسینؑ کو وقت ملتا رہا کہ وہ دشمن کے قلعوں کو مسمار کرتے چلے جائیں چنانچہ بالآخر وہ دن آ گیا جب یزید کو اعترافِ شکست پر مجبور ہونا پڑا، اس نے بیمار اور قیدی علی بن الحسینؑ کو دربار میں طلب کیا اور خون بہا ادا کرنے کی پیش کش کی۔ یہ آخری اموی چال تھی جو یزید کی جانب سے کھیلی جا رہی تھی۔ اس کا مقصد دنیا پر یہ واضح کرنا تھا کہ یزید اور آلِ رسولؐ میں "مصالحت" ہو گئی۔ نہ کوئی فریق جیتا نہ ہارا بلکہ مساویانہ طور پر معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

علی بن الحسینؑ نے بڑی حقارت کے ساتھ یہ پیش کش مسترد کر دی اور مصالحت کے لیے خود اپنے شرائط پیش کیے ——— وہ "فاتح" کی حیثیت سے اپنے حقوق چھوڑنے پر تیار نہیں تھے وہ دنیا کو صاف اور غیر مبہم طریقہ پر یہ جتلانا چاہتے تھے کہ دیکھو ہمیں واضح اور فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی ہے، ایسی فتح جس میں ہم یزید سے اپنے تمام شرائط منوانے کے حقدار ہیں اور یزید ان شرائط کو ماننے پر مجبور ہے!

یزید ہار چکا تھا اس لیے مجبوراً تمام شرائط تسلیم کیے۔ آلِ رسولؐ کی خواتین قید خانے سے نکلیں اور خود یزید کے راج محل میں بیٹھ کر انھوں نے حسینؑ کا سوگ منانے کا اعلان کیا، دمشق کی ہزاروں عورتیں آنا شروع ہوئیں جو سیدۂ زینبؑ اور سیدۂ ام کلثومؑ کو حسینؑ کا پرسا دے رہی تھیں، محل کے بیرونی حصہ میں علی بن حسینؑ تھے جن کی خدمت میں ہزاروں شامی حاضر ہو رہے تھے اور اپنے افعال پر اظہار ندامت کرتے ہوئے حسینؑ کی حقانیت اور یزید کی باطل پرستی کا اعتراف کر رہے تھے خود یزید کی یہ کیفیت تھی کہ وہ محل کے ایک کمرہ میں بیٹھا اشک افشانی میں مصروف تھا اور یہ دیکھ رہا تھا کہ آج ہر شخص اس پر ملامت کر رہا تھا، خود اس کی رعایا اسے ملعون و مردود قرار دے رہی ہے اور پورے شام میں علی بن الحسینؑ کی امامت، ولایت اور حقانیت کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ آج وہ بے بس اور مجبور ہے، اس کا لشکر، اس کی طاقت، اس کا دبدبہ، اس کا شکوہ و حشم سب ختم ہو چکا ہے، علی بن الحسینؑ آج اتنے طاقت ور ہیں کہ ان کے ایک اشارے پر اس کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ اس کے محلات نذر آتش ہو سکتے ہیں۔ اس کے خاندان کا قلع قمع ہو سکتا ہے اور وہ اس درجہ

مجبوری کے عالم میں پہنچ چکا ہے کہ اپنے کمرہ سے باہر بھی نکلنے کی ہمت نہیں کر سکتا، خود اس کی بیوی اس پر لعنت کر رہی ہے اس کے بیٹے اس پر تھوک رہے ہیں اور جس حسینؑ کا سر دروازہ شہر پر آویزاں کیا گیا تھا اس کی حقانیت و صداقت کی قوتیں اس حد تک بڑھ چکی ہیں کہ ان کے مقابلہ میں اس کی حیثیت ایک معمولی قیدی سے زیادہ باقی نہیں رہی ہے!

پورے ایک ہفتہ تک حسینؑ کا گھرانا یزید کے شاہی محل میں حسینؑ کا ماتم کرتا رہا ـــــ نہیں! بلکہ یزید کے راج محل سے حسینؑ کی حقانیت اور کامیابی کا اعلان کرتا رہا اور حسینؑ کی حق پرستی، باطل شکنی اور بے نظیر روحانی فتح کا آوازہ خود اس کے گھر سے بلند ہوتا رہا۔ جس گھر میں گذشتہ تیس سال تک متواتر علیؑ، حسنؑ اور حسینؑ کے خلاف انتہائی گندی گھناؤنی، عیارانہ اور خونی سازشیں ہوتی رہی تھیں۔

خدا نے یہ عظیم کامیابی علی ابن الحسینؑ کی قسمت میں لکھی تھی کہ وہ خود معاویہ اور یزید کے راج محل میں بیٹھ کر اپنی اور اپنے بزرگوں کی حقانیت کا اعلان فرمائیں گے، اور دشمن ان کے مقابلہ میں اس درجہ بے بس ہوگا کہ مجبوری کے عالم میں ایک بند کمرے میں اپنا منہ چھپائے حق پرستوں کے سردار حسینؑ کی تعریفیں اور مرثیے سُنے گا اور خود اپنی ناکامی پر اشکِ خونی بہائے گا!

"ہائے میں نے حسینؑ کو کیوں قتل کیا!" کہے گا اور مُنہ پر طمانچے لگائے گا اور پورے دمشق کو غمِ حسینؑ میں سیہ پوش دیکھے گا اور اپنی عارضی مسرتوں کی پامالی پر حسرت و ندامت کے آنسو برسانے پر مجبور ہو جائے گا!

علی بن الحسینؑ اپنی فتح کی تکمیل کا پورا فیصلہ کیے ہوئے تھے، آپ

دشمن کو ہرگز یہ موقع نہیں دینا چاہتے تھے کہ وہ وقت گذر جانے کے بعد اپنی شکست پر پردہ ڈال سکے چنانچہ آپ جامع مسجد میں تشریف لے گئے، ہزاروں آدمیوں کا مجمع اور یزید بھی موجود، اس کے لشکری بھی حاضر، دیکھنے والے یہ سمجھ رہے ہیں کہ آپ یزید کے بے بس قیدی ہیں، لیکن اب حقیقت کچھ اور ہی ہے، آپ منبر پر چڑھ جاتے ہیں اور فاتحانہ تیوروں سے وہ بلند بانگ خطبہ شروع کرتے ہیں جو دشمن کے دارالحکومت میں ہزاروں دشمنوں کی موجودگی میں ایک ایسا فاتح ہی ادا کر سکتا ہے جس کی فتح یقینی اور فیصلہ کن بن چکی ہو جو یہ یقین رکھتا ہو کہ دشمن اس حد تک کچل چکا ہے کہ اس میں جواب دینے یا احتجاج کرنے کی قوت بھی باقی نہیں رہی ہے! آپ فرماتے ہیں کہ:

"جو مجھے جانتا ہے وہ جانتا ہے، جو نہیں جانتا وہ سن لے کہ میں سیّد الشہدا حسینؑ کا بیٹا ہوں، فاطمہ زہراؑ کا بیٹا ہوں، اس کا پارہ جگر ہوں جو بشیر اور نذیر ہے، جو سراج مُنیر ہے، جو مکّہ و منیٰ کا مالک ہے، جو یثرب و بطحیٰ کا وارث ہے، جو صفا و مروہ کا سردار ہے، میں اُس کا بیٹا ہوں جس کے ساتھ ملائکہ نے آسمان پر نماز پڑھی، میں اس کا فرزند ہوں جو مالک کوثر ہے جو قسیم نار و جنّت ہے، میں اُس کا فرزند ہوں جس پر قرآن نازل ہوا، خدا کے رسولؐ برحق کا فرزند ہوں، میں اس کا بیٹا ہوں جس کے لیے جنّت کے دروازے کھولے گئے، جس پر اللہ کی خوشنودی ظاہر ہوئی، میں اس کا فرزند ہوں جو ظلم و ستم سے شہید کیا گیا، جس کا سر پسِ گردن سے جدا کیا گیا، میں اس کا فرزند ہوں جس کی لاش بے گور و کفن چھوڑ دی گئی، میں اس کا بیٹا ہوں جو تین دن کا پیاسا ذبح کر ڈالا گیا، میں اس کا فرزند ہوں جس کی بے کسی پر ملائکہ آسمان نے آنسو بہائے!"

"لوگو! خدا نے سخت مصائب سے ہمارا امتحان لیا۔ اس نے ہمارے لیے ہدایت کو مخصوص کیا، ہمارے دشمنوں کو ہلاکت نصیب کی، خدا نے ہم

کو تمام عالم پر فضیلت دی اور ہمیں وہ چیزیں عطا کیں جو کسی کو نہیں ملیں، ہمیں خدا نے علم دیا، حلم دیا، شجاعت دی، اپنی محبت سے سرفراز کیا، رسولؐ کی اُلفت عطا فرمائی اور اس طرح ہمیں اپنی بارگاہ میں برگزیدہ کیا۔"

دشمن کے دارالحکومت میں جہاں دشمن کے شاہانہ جلال و جبروت کا سارا سامان موجود ہو، جہاں وہ خونخوار سپاہی بھی موجود ہوں جنھوں نے ابھی چند ماہ قبل حسینؑ اوران کے دل کے ٹکڑوں کو ذبح کر ڈالا تھا، اور جہاں دشمن کی طاقت، سلطنت اور دولت کے تمام مظاہر اکٹھا ہوں وہاں یہ تقریر کوئی بے بس کر سکتا تھا؟ بنی اُمیّہ کے کسی گنہگار کی یہ مجال تھی کہ وہ یہ خطبہ کہتا؟ یزید کی موجودگی میں اپنی بڑائی بیان کرتا؟ ——اور یزید خاموش بیٹھا رہتا—— کم از کم میں اسے تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوں!

اور پھر علی بن الحسینؑ نے اسی پر اکتفا نہیں کی، ادھر آپ کا خطبہ جاری تھا، ادھر اذان شروع ہو گئی۔ مؤذّن نے کہا، اَشْہَدُ اَنَّ مُحَمَّدً رسُولُ اللّٰہ (میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں) آپ نے فوراً یزید کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا:

"کیوں یزید! یہ محمدؐ میرے جدّ تھے یا تیرے جدّ؟"

یزید نے عرض کی، "بے شک وہ آپ کے جدّ تھے!"

آپ نے فرمایا کہ "یزید! کیا تو نے اس محمدؐ کی آل کو قتل نہیں کیا؟ محمدؐ کے جگر بند کو ذبح نہیں کیا؟ ان کی نواسیوں کو گرفتار نہیں کیا؟ اور آلِ رسولؐ کو لوٹ کر جہنم کا سزاوار نہیں بنا؟"

یزید خاموش ہو گیا، اس کا سر جھک گیا اور ماتھے پر ندامت کا پسینہ چھلکنے لگا۔

کیا کوئی مجبور قیدی، بے بس و ناچار، یزید کے سے جابر اور طاقتور سلطان سے اس قسم کی گفتگو کر سکتا تھا؟ ہرگز نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک فاتح کی گفتگو تھی مفتوح سے، فاتح علی بن الحسینؑ کی بات چیت شکست خوردہ یزید سے۔

جب علی بن الحسینؑ بار بار اپنی فتح کا مظاہرہ کر چکے اور دنیا نے ناقابل انکار طریقہ پر یہ سمجھ لیا کہ یزید ایک شکست خوردہ اور مفتوح بادشاہ ہے تو امام نے مدینہ واپس ہونے کا فیصلہ کیا۔ آپ روانہ ہوئے، لیکن روانگی کی شان مختلف تھی، آپ دمشق آئے تھے تو قیدی کی حیثیت تھی لیکن جب دمشق سے واپس ہوئے تو فاتح کی شان تھی، آگے آگے پانچ سو عرب شہسوار، نیزے تانے، سروں کو جھکائے مؤدب، جلوس کی حیثیت سے رواں، ان کے عقب میں خواتین کی عماریاں، زرکار پردوں اور مخمل کے تکیوں سے آراستہ، آخر میں حسینؑ کا جگر بند، فاتحانہ دبدبہ چہرہ سے عیاں، حق کے شرارے نگاہوں سے برستے ہوئے، زبان پر اللہ، رسولؐ اور حسینؑ کی تعریف، جلو میں خود یزید اور اس کے ارکان حکومت اپنی شکست پر ماتم کناں، اپنی ناکامی پر نوحہ گر اور احساس ندامت سے ڈوبے ہوئے!

کیا کوئی مفتوح و مغلوب، کوئی شکست خوردہ اور ہارا ہوا اس شان سے رخصت ہوتا ہے، نہیں! یہ فاتح کی سواری تھی، یہ کامیاب و کامران حسینی لشکر کے کمانڈر انچیف کا سفر تھا، یہ اس علی بن الحسینؑ کی رخصت تھی جو قیدی بن کے ایک عجیب و غریب جنگ لڑا تھا، جس نے دشمن کے قلب میں گھس کر اس پر وار کیا تھا، جس نے مظلومی اور حقانیت کے حربوں سے دشمن کو خود اس کے دارالحکومت میں شکست فاش دی تھی اور اب فتح کا پرچم لہراتا، کامیابی کے جھنڈے اڑاتا اپنے وطن کو واپس ہو رہا تھا۔ آج بھی دمشق کی بازاریں بھری ہوئی تھیں لیکن حاضرین کے چہروں پر کامیابی کی مسرتوں کے

بجائے ندامت جھلک رہی تھی، آج نہ وہ شمر تھا جو سکینہؑ کو دُرّے مار سکتا اور نہ وہ عمر سعد تھا جو علی بن الحسینؑ کو ہتھکڑیاں پہنا سکتا۔ آج نہ وہ یزیدی جاہ و حشم تھا جس سے قیصر روم تھرتھراتا تھا اور نہ وہ شامیوں کی شوکت تھی جس پر دمشق نازاں تھا۔ آج یہ سب چیزیں حسینؑ اور علی ابن الحسینؑ کے قدموں تلے روندی جا چکی تھیں، شامی سلطنت ان کے قدموں پر جھکی ہوئی اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی۔ قافلہ بڑھا اور جب شہر کے خاص بازار میں پہنچا تو حسینؑ کے دلبند نے اپنا ناقہ روکا، ایک قیامت خیز تقریر کی، ایسی تقریر جس سے یزیدیت اور باطل پرستی کے ایوان لرز اُٹھے، حسینؑ کی حقانیت روز روشن کی طرح آشکار ہو گئی اور شہر کے در و دیوار حسینؑ کی صداقت کے اعتراف سے گونجنے لگے۔ علی بن الحسینؑ چلے گئے دمشق سونا پڑ گیا، اور شہر پر وہی مُردنی، وہی بے رونقی اور وہی یاس برسنے لگی جو ایک شکست خوردہ دارالحکومت کی شان ہوا کرتی ہے!

سیدانیوں کا قافلہ شام سے نکلا اور عراق پہنچا، اسی عراق میں جہاں حسینؑ کے لیے دنیا تنگ کر دی گئی تھی، جس کا ذرہ ذرہ آلِ رسولؐ کا دشمن تھا، لیکن آج صورتِ حال مختلف تھی۔ آج یہ قافلہ جدھر سے گذرتا تھا اُدھر اس کا شاہانہ استقبال کیا جاتا تھا، جہاں قیام کرتا تھا وہاں کوئی بیبیوں کے خیموں کے نزدیک پَر نہیں مار سکتا تھا۔ یزیدی لشکر جو محافظ دستہ اور جلوس کا فرض انجام دے رہا تھا خیموں سے دُور ٹھہرتا تھا تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بیبیوں میں سے کسی پر نظر پڑ جائے۔ راستہ طے ہوتا رہا علی بن الحسینؑ کا حکم تھا کہ ہم کربلا جائیں گے، چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ قافلہ کربلا پہنچا اسی کربلا میں جہاں ایک سال قبل آلِ رسولؐ کو ذبح کیا گیا تھا، لُوٹا گیا تھا، قیدی بنایا گیا، لیکن آج وہاں کی حالت بھی مختلف تھی۔ یہ لشکر کربلا میں احساس شکست کے ساتھ داخل ہو رہا تھا اور فتح و کامیابی کے

سارے خواب منتشر ہو چکے تھے، آج نہ زینبؑ کے بازو رسن بستہ تھے نہ سید سجاد کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں، آج کربلا کی سرزمین پر حسینؑ کے کنبہ کا راج تھا اور یزید کے سپاہی مُنہ چرائے ندامت سے آنکھیں جھکائے اپنے ظلم و ستم کی داستانوں کو سُن رہے تھے جو سیدانیوں کی فریاد و فغاں کی صورت میں کربلا کی سرزمین پر دُہرائی جا رہی تھیں۔ آج کربلا کی سرزمین پر دنیا کے سب سے بڑے حق پرست مجاہد کا ماتم ہو رہا تھا اور اس طرح اس ماتم کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی جو تیرہ سو سال سے آج تک دنیا کے گوشہ گوشہ میں جاری ہے! ——— وہ ماتم جس میں صرف مسلمان ہی شریک نہیں ہوتے بلکہ ہندوستان کے وہ کروڑوں ہندو بھی شرکت کرتے ہیں جن کو حقانیت اور صداقت کے اصولوں سے محبت ہے جو روحانیت کے اس مظہر اتم سے جس کا نام حسینؑ تھا سچی اور گہری عقیدت رکھتے ہیں اور جن کے دلوں میں نسل، وطن، مذہب یا رنگ کے امتیازات سے بالاتر ہو کر ایک عربی ہاشمی مسلمان حق پرست سے بھی اتنی محبت پیدا ہو گئی ہے جتنی کہ کسی مسلمان "حسینی" کو ہو سکتی ہے۔

دمشق اور کربلا میں حسینؑ کا ماتم کر چکنے ——— نہیں ——— بلکہ ان مقامات پر حسینؑ کی حقانیت، صداقت، روحانیت اور ابدی فتح کا پرچم لہرا چکنے کے بعد ——— آلِ رسولؐ نے مدینہ کا رُخ کیا، اسی مدینہ کا جس کی زمین ایک دن حسینؑ پر تنگ کر دی گئی تھی، علی بن الحسینؑ سیدانیوں کا قافلہ ساتھ لیے مدینہ پہنچے تو وہاں کے حالات بھی بدل چکے تھے، اب نہ یزید کے گورنر میں یہ طاقت تھی کہ وہ آلِ رسولؐ سے بیعت کا مطالبہ کرتا اور نہ مروان میں یہ سکت تھی کہ وہ حسینؑ کے جانشین کو موت کی دھمکی دیتا، مدینہ میں علی بن الحسینؑ کا پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا وہ فاتحانہ شان سے شہر میں داخل ہوئے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا استقبال مسرت کے

ترانوں سے نہیں کیا گیا، آنسوؤں اور آہوں سے کیا گیا، لیکن استقبال ضرور ہوا اور یزید کے گورنر کی یہ ہمت نہیں ہوئی کہ وہ اس استقبال کو روک سکتا پورا مدینہ نوحہ و ماتم کی صداؤں سے گونج اٹھا، اور جب سیدانیاں قبر رسولؐ پر حاضر ہوئیں تو وہ تاریخی مسجد جس میں بیٹھ کے ایک دن ان کے نانا نے قیصر و کسریٰ کی قسمتوں کا فیصلہ کیا تھا، مدینہ والوں کی گریہ و زاری سے لرزنے لگی۔ آج مدینہ پر یزید کا قبضہ نہیں تھا، حسینؑ اور حسینؑ والوں کا قبضہ تھا۔ دمشق سے کربلا تک اور کربلا سے مدینہ تک آج ساری اسلامی دنیا حسینؑ کے قبضہ میں تھی، اس حسینؑ کے قبضہ میں جس نے مر کے جنگ جیتنے کا انوکھا طریقہ ایجاد کیا تھا۔ اس حسینؑ کے قبضہ میں جس نے حق کی خاطر جان دے کر باطل کے زور حکومت کو نیچا دکھایا تھا، اس حسینؑ کے قبضہ میں جس نے بے بس عورتوں اور ناچار خواتین کے ذریعے یزیدی سلطنت کے پرخچے اڑا دیے تھے، اس حسینؑ کے قبضہ میں جس نے محض مٹھی بھر حق پرستوں کی مدد سے حکومت کے غرور اور دولت کے نشے کو خاک میں ملا دیا تھا، اور اس حسینؑ کے قبضہ میں جس نے نسلِ انسانی کیلئے ایک عملی مثال پیش کر کے اسے یہ تعلیم دی تھی کہ ——— تعداد کی کمی سے خوف زدہ نہ ہو، دشمن کی طاقت سے مرعوب نہ ہو، اگر حق تمہارے ساتھ ہے تو ابدی اور دائمی فتح قطعاً تمہیں کو نصیب ہو گی!

"مکّہ اور مدینہ کی تاراجی"

حسینؑ کی شہادت کے بعد سے آج تک جہاں ساری دنیا کے حق پرست، حق آگاہ اور باطل دشمن انسان خواہ وہ ہندو ہوں خواہ مسلمان خواہ عیسائی ہوں، خواہ سکھ، خواہ پارسی ہوں خواہ لامذہب، حسینؑ کی مدح سرائی میں مصروف رہے ہیں وہیں ایک ایسا بدقسمت طبقہ بھی موجود رہا ہے جس نے مجسمۂ باطل یزید کی پاسداری میں اسے قتلِ حسینؑ سے بچانے کے لیے، اور حسینؑ کو دنیا کی نگاہوں سے گرانے کے لیے ہمیشہ ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے، اس طبقہ کے افراد یزید کی بداعمالیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے طرح طرح کی تاویلیں ایجاد کرتے ہیں۔ کبھی تو یہ کہتے ہیں کہ حسینؑ کے قاتل کوفہ کے سپاہی تھے، یزید قاتل نہیں تھا، اور کبھی حسینؑ پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ وہ کیوں کربلا گئے جو شہید ہوئے، نہ کربلا جاتے اور نہ مارے جاتے، کبھی یہ ارشاد ہوتا ہے کہ حسینؑ کو اپنے ساتھ عورتوں کو نہیں لے جانا چاہیے تھا، نہ عورتیں جاتیں اور نہ گرفتار ہوتیں، اور کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ قدرت کو یہی منظور تھا کہ حسینؑ قتل ہو جائیں، اس لیے یزید پر کیا الزام؟ ——— اور جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ یہ کند حربے کامیاب نہیں ہوتے، یہ ناقص تاویلیں اثر انداز نہیں ہوتیں اور ان کی پچھے دار تقریروں کے باوجود دنیا کی نگاہوں میں خوار ہیں تو یہ دلیل تراشی جاتی ہے کہ

"یزید کو بُرا نہ کہو اس لیے کہ یزید قیامت کے دن حسینؑ سے اپنی خطا کی معافی مانگ لے گا، حسینؑ وسیع القلب ہیں اس لیے وہ یزید کو معاف کر دیں گے اور یزید سیدھا جنت میں چلا جائے گا۔ ایسی حالت میں جو لوگ "جنتی یزید" کو بُرا کہیں گے وہ جہنم میں پھینک دیے جائیں گے!"

ایسے لوگ یا تو تاریخ سے ناواقف ہیں اور یا پھر وہ دیدہ و دانستہ دنیا کو دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ قیامت کے دن یزید کو معاف کر دیں گے اور وہ جنّت میں چلا جائے گا تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ نمرود، فرعون، ہیرودؤ، کنس، راون اور گوڈسے وغیرہ بھی جنتی ہیں اس لیے اُن کو بھی بُرا نہیں کہنا چاہیے، کیونکہ ابراہیمؑ نمرود کو، موسیٰؑ فرعون کو، مسیحؑ ہیرودؤ کو، کرشن کنس کو، رام راون کو، اور گاندھی گوڈسے کو معاف کر دیں گے۔ اگر اسی فلسفے کو مان لیا جائے تو دنیا میں نیکوں اور حق پرستوں کی کوئی قدر باقی نہ رہے، کیونکہ جب باطل پرست، بدکار، ظالم اور خطاکار بھی جنتی بننے والے ہیں تو کسی کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ نیکو کاری کی زندگی بسر کرے، اپنے دنیاوی عیش پر پابندیاں قبول کرے اور مفاد پرستی پر خدا ترسی کو ترجیح دے کے نقصان اٹھائے؟ اگر شمر، یزید اور عمر سعد بھی جنت میں جانے والے ہیں تو کسی کو حق کی خاطر حسینؑ کے سے مصائب برداشت کرنے کی کیا ضرورت ہے —— یہ ایک بالکل جھوٹی تاویل ہے اور عقل اسے کسی حالت میں بھی قبول نہیں کر سکتی!

قطع نظر اس کے کہ یہ دلیل از حد کمزور ہے، مجھے تو یہ عرض کرنا ہے کہ یزید کے دوست تاریخ اور اس کے حقائق پر پردہ نہیں ڈال سکتے اور قتل حسینؑ کے بعد یزید نے جو بد اعمالیاں کی ہیں، وہ بجائے خود ایسی ہیں کہ یزید نے پیغمبرؐ اسلام کے گھرانے کو ذبح نہ بھی کیا ہوتا تب بھی وہ محض ان

حرکتوں کے نتیجے میں جو اس نے قتل حسینؑ کے بعد کی ہیں نفرین اور مذمت کا مستحق ہے!

امام حسینؑ کی شہادت کے دو سال بعد یزید نے مدینہ پر چڑھائی کی اس مدینہ پر جسے دنیا کا ہر مسلمان ایک مقدس شہر تسلیم کرتا تھا، جو پیغمبر اسلامؐ کی دائمی خوابگاہ تھا، جو اسلام کا گہوارہ اور قلب کہلاتا تھا اور جہاں اس وقت بھی رسولؐ کے سینکڑوں صحابی موجود تھے۔ یزیدی لشکر نے مدینہ میں قتلِ عام کیا جس کے نتیجہ میں دس ہزار صحابہ اور تابعین قتل ہوئے، قبر رسولؐ پر گھوڑے باندھے گئے، مکانات نذرِ آتش کیے گئے، مال و اسباب لوٹا گیا اور پیغمبر اسلامؐ کی مدد کرنے والے انصار کی باعصمت خواتین کی جبراً آبروریزی کی گئی، ہزاروں عورتوں سے زنا کاری کی گئی، مقدس مزارات اور مقامات مٹا دیے گئے اور مدینہ کو اس طرح تاراج کیا گیا کہ وہ مسلمان کی زیارت گاہ تو باقی رہا لیکن اس واقعہ کے بعد سے کبھی مسلمانوں کا قومی و سیاسی مرکز نہیں بن سکا!

کہاں ہیں وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ حسینؑ مدینہ سے کربلا کیوں چلے گئے؟ وہ آئیں اور دیکھیں کہ حسینؑ نے اس لیے مدینہ چھوڑ دیا تھا کہ اگر وہ مدینہ میں موجود رہتے تو یزید ان سے جنگ کی آڑ لے کر مدینہ پر حملہ کرتا اور مدینہ کی جو بربادی ہوتی اس کی ذمہ داری یزید کے دوست ہمیشہ یہ کہہ کے حسینؑ پر ڈالا کرتے کہ ——— نہ حسینؑ مدینہ میں رہتے اور نہ یزید حملہ کرتا، اس لیے مدینہ کی بربادی کی ذمہ داری حسینؑ پر ہے، یزید پر نہیں!

جب یزیدی لشکر مدینہ میں قتلِ عام کر چکا تو اس نے مکہؔ کا رُخ کیا ——— اس مکہؔ کا جہاں کعبہ شریف ہے، جسے اسلامی شریعت دارالامن قرار دیتی ہے اور جہاں انسان تو کیا، جانور کا خون بہانا بھی مسلمانوں کے لیے حرام ہے! ——— لیکن یزیدی لشکر نے کیا کیا؟ اس نے مکہؔ پر حملہ کر کے وہاں بھی قتلِ عام کیا، خانہ کعبہ میں، جسے مسلمان "خدا کا گھر"

کہتے ہیں آگ لگا دی، تبرکات جل کے خاک ہو گئے اور ان تمام مقدس مقامات کو جنھیں مسلمان آنکھوں سے لگاتے ہیں اس طرح قدموں تلے روندا کہ عرصہ تک ان کے نشانات بھی ناپید رہے!

سوال یہ ہے کہ کیا خانہ کعبہ کو آگ لگا دینے والا، مسجد رسولؐ میں گھوڑے بندھوا دینے والا، ہزاروں صحابیوں کو قتل کروا دینے والا، انصار کی عورتوں کی آبرو ریزی کرانے والا، مقدس آثار کو منہدم کرا دینے والا، اور اسلام کے مرکزی شہروں کو تاراج کروا ڈالنے والا یزید بھی جنت کا مستحق ہے؟ ——— اگر ان افعال کے باوجود یزید جنت میں جانے والا ہے تو مجھے یقین ہے کہ دنیا کا کوئی سمجھدار، نیک اور حق پرست انسان اس جنت میں جانا قبول نہ کرے گا جس میں یزید کے سے لوگ رکھے جاتے ہوں، اور اگر یزید کو جنّت عطا کرنے والے خدا کی انصاف پسندی، تو اس کے متعلق خاموشی ہی بہتر ہے۔

"انتقام"

مثل مشہور ہے کہ بے گناہ کا خون بالا بالا نہیں جاتا ، وہ رنگ لاکر ہی رہتا ہے۔ خدا کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں ،چنانچہ حسینؑ کے سلسلہ میں بھی وہی ہوا جو دنیا کا قانون ہے اور ظالموں کو عاقبت کے ساتھ ہی دنیا میں وہ سزا حاصل ہوئی جو واقعی عبرت انگیز کہی جاسکتی ہے!

شہادت کے بعد ہی ساری دنیائے اسلام میں انتقام اور بغاوت کی چنگاریاں سلگنے لگی تھیں ، یزید اور اس کے ساتھیوں نے یہ چاہا کہ وہ طاقت کے بل پر ان چنگاریوں کو دبا دیں لیکن یہ ان کی غلطی تھی ، انھوں نے اس سلسلہ میں تشدد برتا اس نے آگ کو کم کرنے کے بجائے اسے اور زیادہ بھڑکا دیا اور آخر وہ دن نزدیک آگیا جب انتقام کا آرہ اپنی پوری حشر سامانیوں سے چلا اور وہ تمام ظالم جنھوں نے ایک دن طاقت ، سلطنت اور دولت کے نشہ میں چُور ہوکر حسینؑ اور اس کے ساتھیوں کو بے جرم وخطا ذبح کر ڈالا تھا خود اسی بھیانک خونریزی کے شکار ہوگئے ، جس کی ابتدا کرنے والے وہ خود تھے! کربلا میں یزیدیوں نے جو آگ بھڑکائی تھی اس میں ایک دن خود انہیں کو جلنا پڑا اور میں یہاں اس واقعہ کو مختصر طور پر صرف اس لیے بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس سے انسانوں کو عبرت و موعظت حاصل ہوگی جو ظالموں کی طاقت سے مرعوب وخوف زدہ ہو جاتے ہیں ، اپنے حقوق کی پامالی برداشت کرلیتے

ہیں اور ظلم و معاصی صرف اس ڈر سے نہیں کرتے کہ ان کو ظالم کی سزا کا یقین نہیں ہوا کرتا!

تاریخ شاہد ہے کہ ظالموں اور باطل پرستوں کو کبھی فروغ حاصل نہیں ہوا ان کی طاقت ہمیشہ عارضی ثابت ہوئی اور ایک دن ایسا ضرور آیا جب ان کو دنیا میں ہی اپنے مظالم کی ایسی سزا ملی ہے کہ جس کے تصوّر سے بھی عبرت کا بدن کانپ جاتا ہے۔ کربلا والوں کے قاتلوں کو بھی ایک دن اسی قانون قدرت کا سامنا کرنا پڑا اور ان کو اپنے بھیانک مظالم کی وہی سزا ملی جس کے وہ پورے طور پر مستحق تھے!

قتل حسینؑ کے محض تین سال بعد یزید کا انتقال ہوگیا اور اس کا بیٹا معاویہ خلیفہ بنایا گیا، معاویہ بن یزید نے خلافت کے پہلے ہی دن اپنے باپ دادا پر لعنت کی جس کے نتیجہ میں اموی سرداروں نے اسے زہر دے کر ہلاک کردیا، اس کے دوسرے بھائی خالد بن یزید کا بھی چند دنوں میں خاتمہ ہوگیا اور اس طرح یزید کی نسل دنیا سے ناپید ہوگئی! دمشق کے تخت پر مروان کا قبضہ ہوگیا اور اس کے بعد عبدالملک بن مروان خلیفہ مقرر کیا گیا!

اس دوران میں ساری دنیائے اسلام میں اموی مظالم کے خلاف آگ بھڑک چکی تھی۔ چنانچہ سب سے پہلے کوفہ کے لوگوں نے سلیمان بن صرد خزاعی کی قیادت میں اموی اقتدار کے خلاف تلوار سنبھالی اور انتقام خون حسینؑ لینے کے لیے میدان میں آگئے، سلیمان اور ان کے ساتھی چونکہ تعداد میں کم تھے اس لیے ان کو شکست ہوگئی، سلیمان مارے گئے اور انتقام خونِ حسینؑ کی تحریک مختار کے ہاتھوں میں آگئی!

مختار نے کوفہ پر قبضہ کرلیا، بصرہ فتح کرلیا اور چند ہی دنوں میں پورے عراق پر ان کا قبضہ ہوگیا، عبیداللہ بن زیاد نے اسّی ہزار سپاہیوں کے لشکر کی مدد سے ان کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی، لیکن اب بازی

دل چکی تھی۔ مختار کے سپہ سالار ابراہیم نے بھی تو بن زیاد کی تمام اولادوں کا کام تمام کر دیا، اس کے بعد خزانہ پر قبضہ کر لیا اور پھر ایک سخت جنگ کے بعد خود اس ملعون کا بھی خاتمہ کر دیا!

قدرت کا کرشمہ دیکھیے کہ ابن زیاد بھی عاشور کے دن قتل ہوا—— عاشور ۶۱ھ میں اس نے حسینؑ کو قتل کیا اور ۶۵ھ کو خود اسے ذبح کر ڈالا گیا!

ابراہیم نے ابن زیاد کا سر کاٹ کر کوفہ بھیج دیا۔ چنانچہ یہ سر عین اسی مقام پر رکھا گیا جہاں اب سے چار سال قبل سر حسینؑ ابن زیاد کے دربار میں پیش کیا گیا تھا۔ یہ سر مختار کی خدمت میں پیش ہوا، اور مختار نے اسے جوتوں تلے روندنے کے بعد مزبلہ پھینکوا دیا!

ابن زیاد سے فرصت پا کے مختار قاتلان امام کی جانب متوجہ ہوئے چنانچہ شمر قتل کر دیا گیا اور اس کا سر جامع مسجد کے سامنے لٹکا دیا گیا، خولی بن یزید اصبحی کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسے بھڑکتی ہوئی آگ کے سپرد کر دیا گیا۔ حضرت عباسؑ کے قاتل حکیم بن طفیل پر تیر باراں کرایا گیا، علی اکبرؑ کے قاتل مرہ بن منقذ کو برچھیوں کے حوالے کیا گیا، سنان بن انس کے ہاتھ پیر کٹوا کے اسے کھولتے ہوئے تیل کے کڑھاؤ میں ڈال دیا گیا۔ عبداللہ بن عقبہ کی کھال کھینچوا کے اسے زندہ جلوا دیا گیا اور معصوم علی اصغرؑ کے قاتل حرملہ بن کاہل کے ہاتھ پیر کاٹ کے اسے نذر آتش کر دیا گیا!

عمر سعد کوفہ سے بھاگ نکلا تھا لیکن اسے گرفتار کیا گیا، اور شدید عذاب کے ساتھ قتل کرا دیا گیا، معرکہ کربلا میں شرکت کرنے والے دوسرے یزیدی سرداروں کا بھی یہی حشر ہوا، اور ان کو وہی سزائیں حاصل ہوئیں جن کے وہ مستحق تھے۔ جن لوگوں نے امام حسینؑ کی لاش

گھوڑوں سے پامال کی تھی ان کو گرفتار کرکے زمین پر لٹایا گیا اور ان پر گھوڑے دوڑا دیے گئے جس سے یہ سب لوگ تڑپ تڑپ کر ہلاک ہو گئے!

مورخین کا بیان ہے کہ امام حسینؑ کے خون ناحق کے بدلے میں ستّر ہزار آدمی قتل ہوئے اور ان لوگوں میں سے جنھوں نے کربلا کے حق پرست مجاہد کے خلاف لشکر کشی کی تھی ایک شخص بھی قدرت کے اس عتاب و انتقام سے محفوظ نہیں رہا جس کا نازل ہونا اس انصاف کا عین تقاضہ ہے جو قدرت ظالموں کے ساتھ خود اسی دنیا میں کرتی ہے!

انتقام کی آگ محض مختار کی تحریک تک محدود نہیں رہی، بلکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ سلسلہ کافی عرصہ تک جاری رہا، اور محض نصف صدی میں ایسے حالات پیدا ہو گئے جن میں نہ صرف یہ کہ بنی امیہ کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا بلکہ بنی عباس کی فوجوں نے بنی اُمیہ کے ایک ایک فرد کو قتل کر ڈالا۔ امویوں کی پوری نسل دنیا سے مٹ گئی، جن لوگوں نے حسینؑ مظلوم کی نسل کو ختم کرنے کی کوشش کی تھی ان کو قدرت نے یہ ہولناک سزا دی کہ آج دنیا میں ان کا کوئی نام لیوا باقی نہیں ہے۔ بنی امیہ نے حسینؑ اور ان کی نسل کو ختم کر دینا چاہا لیکن قدرت نے اپنے دستور کے مطابق حق پرستوں کا ساتھ دیا۔ چنانچہ آج حسینؑ کا روضہ ساری دنیا کے زائرین سے چھلکتا نظر آتا ہے، دنیا کے گوشہ گوشہ میں حسینؑ کے نام سے امام باڑے موجود ہیں، حسینؑ کے مزار کی نقلیں تعزیہ کے نام سے گاؤں گاؤں میں نظر آتی ہیں، بلا افتراق مذہب و ملت دنیا کا ہر حق پسند حسینؑ کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے اور حسینؑ کی نسل کے سادات نہ صرف عراق، عرب اور

ایران میں موجود ہیں بلکہ خود ہمارے پاکستان ، ہندوستان میں لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ اس کے برعکس حسینؑ کے دشمنوں کو دیکھیے بنی امیہ کے بادشاہوں کی قبروں کا بھی کوئی نشان نہیں ملتا۔ یزید جس مقام پر دفن ہوا تھا وہ آج شیشہ گلانے کی بھٹی ہے جس میں دن رات آگ بھڑکا کرتی ہے ، بنی امیہ کی نسل اس طرح ختم ہوئی کہ آج معاویہ اور یزید کا کوئی نام لیوا باقی نہیں اور پھر اس کھلی ہوئی حقیقت سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ آج دنیا کے لاکھوں انسانوں کا نام حسینؑ کے نام پر رکھا جاتا ہے لیکن دنیا کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک چلے جایئے آپ کو یزید یا شمر کے نام کا ایک شخص بھی نہیں مل سکتا !

یزید اور شمر کسی زمانے میں مسلمانوں کے نام تھے لیکن آج یہ الفاظ گالی بن چکے ہیں ، اگر کسی شخص کو ان الفاظ سے موسوم کر لیا جائے تو مجھے یقین ہے کہ وہ مرنے مارنے پر تیار ہو جائے گا!

حسینؑ نے حق کے لیے جان دی ، انھوں نے حق کی خاطر حکومت کی طاقت اور سلطنت کے دباؤ کی پروا نہیں کی ، انھوں نے ایمان اور انسانیت کی خاطر اپنا بھرا پُرا گھر لٹا دیا تو قدرت نے ان کو اس کا یہ بدلہ دیا کہ آج ساری دنیا ان کی عزت کرتی ہے ، ان کے نام پر جان چھڑکتی ہے ، ان کی یادگار منانا اپنا فرض جانتی ہے ، ان کے روضہ کی شبیہہ یعنی تعزیہ کو عقیدت سے چومتی ہے اور محبت سے اپنے کندھوں پر بلند کرتی ہے۔ لاکھوں آدمی اپنے بچوں کے ناموں میں حسینؑ کا نام شامل کرتے ہیں اور ہر سال محرم کا چاند نکلتے ہی ہر گھر سے ماتم کی آوازیں بلند ہو جاتی ہیں۔

اس کے برعکس یزید نے سلطنت ، دولت ، فوج اور ظاہری

طاقت کے سہارے حقانیت، روحانیت اور انسانیت کی قدروں کو کچل دینا چاہا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قدرت نے اسے ذلیل و رسوا کیا، اس کی نسل تک فنا ہو گئی، اس کا نام گالی بن گیا اور آج دنیا کا ہر حق پسند انسان اس پر نفرین کرنا اپنا فرض تصور کرتا ہے۔

ہمارے لیے اس واقعہ میں بڑی نصیحت ہے، بڑی عبرت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حق پر مرنے والے ہمیشہ کے لیے زندہ ہو جاتے ہیں، ان کو دائمی عزت اور دائمی زندگی حاصل ہوتی ہے، ان کے دشمنوں کو اس دنیا میں سزا اور اس دنیا میں عذاب نصیب ہوتا ہے، ان کا نام و نشان مٹ جاتا ہے اور ظاہری طاقت و ثروت کے بل پر ظلم و ستم کرنے والے کو خود اس دنیا میں وہ دردناک سزائیں بھگتنا پڑتی ہیں جن کا تصوّر بھی روح میں کپکپی پیدا کر دینے کے لیے کافی ہوا کرتا ہے!

فخرِ آدمؑ

بزمِ امکان پر ایک سناٹا طاری تھا، جیسے پوری کائنات سوئی ہوئی تھی! اس کائنات میں کسی چیز کی کمی نہ تھی، آفتاب کی نور فشانیاں بھی تھیں اور ماہتاب کی ضیا باریاں بھی، ستاروں کی محفل آراستہ تھی، ہوائیں نغمہ بار تھیں، دریاؤں میں روانی تھی، سمندروں میں جلال تھا، پہاڑوں میں جبروت تھا، فضاؤں میں ترنم تھا، درختوں میں لچک تھی، پھولوں میں مہک تھی، غرض ساری دنیا اس طرح آراستہ و پیراستہ تھی جیسی کہ آج ہے

بزمِ قدس میں بھی کسی شے کی کمی نہ تھی۔ ملائکہ فوج در فوج موجود تھے، تسبیح و تہلیل کی صداؤں سے بزمِ فلک گونج رہی تھی، سجدہ کرنے والے سجدہ سے سر اٹھانے پر تیار نہ تھے، رکوع میں رہنے والوں کو سجدہ کرنے کی فرصت نہ تھی، قیام والے قیام میں اور قعود والے قعود میں مصروف تھے، جنّت کی سکوں بار فضاؤں میں عبادت و ریاضت کے مشاغل جاری تھے، غرض نہ کائنات کے حسن میں کمی تھی نہ ذوقِ عبادت میں کوئی قصور، لیکن خود پیدا کرنے والے کو ابھی تک کسی شے کی کمی محسوس ہو رہی تھی، اسے نہ تو اس طغیانِ حسن پر مسرّت تھی نہ اس ہنگامۂ تسبیح پر اطمینان وہ کچھ اور ہی چاہتا تھا، کسی اور ہی شے کا طالب

تھا! اس کمی کو دُور کرنے کے لیے وہ تاریخی ندا بلند ہوئی جس نے بزمِ قدس میں ایک ہلچل پیدا کر دی :-

"میں زمین پر اپنا خلیفہ مقرّر کرنا چاہتا ہوں!"

اس جملہ میں نہ معلوم کون سی طلسمی کیفیت تھی کہ وہ ملک بھی تڑپ اٹھے جو آرزو سے خالی اور تمنا سے بے نیاز کہے جاتے ہیں! اور جب بزمِ قدس کے سُکّان کو یہ معلوم ہوا کہ ایک مٹی کا پُتلا اس منصبِ عظمیٰ پر فائز ہونے والا ہے تو اُن کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، اب خاموشی کا موقع نہیں تھا، اس لیے ملائکہ یہ عرض کرنے پر مجبور ہوئے کہ "پالنے والے! یہ کیا؟ ہم تیری تسبیح و تقدیس کرنے والے ہیں، عبادت گذار مخلوق ہیں، رکوع و سجود میں زندگیاں گذار رہے ہیں۔ ہمیں نظر انداز کر کے ایک ایسی مخلوق کو جو زمین پر خونریزی اور فساد کی مرتکب ہو گی، اس عظیم منصب پر فائز کرنے کا مقصد؟

قدرت نے اس بات کا عجیب و غریب جواب دیا، آدمؑ اور ملائکہ دونوں کو امتحان کے میدان میں کھڑا کر دیا، اور ذہانت کا امتحان ہوا، آدمؑ زیادہ ذہین و عالم ثابت ہوئے اس لیے ملائکہ کو حکم دے دیا گیا، کہ آدمؑ کو سجدہ کرو، بات بظاہر آئی گئی ہو گئی، ملک خاموش ہو گئے اور آدمؑ کو زمین کی خلافت حاصل ہو گئی!

بات بظاہر ختم ہو گئی لیکن انصاف کی بات تو یہ ہے کہ ملائکہ کے دعوے کا جواب نہیں ہوا، ملائکہ نے یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ وہ عقل و ذہانت میں آدمؑ پر فضیلت رکھتے ہیں، ان کا دعویٰ تو یہ تھا کہ وہ عشق و اطاعت میں آدمؑ پر افضل ہیں،

انھوں نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں اپنے کسی علم یا ذہنی کارنامہ کا ذکر نہیں کیا تھا، اپنی تسبیح و تقدیس کا ذکر کیا تھا جس کا تعلق علم و عقل سے نہیں عشق و عبادت سے ہے۔

ملائکہ نے آدمؑ کے علم و ذہانت کو مان کے ان کے سامنے پیشانی خم کر دی، لیکن اُن کا یہ دعویٰ اپنے مقام پر باقی رہا کہ عشق و اطاعت کے معاملہ میں وہ آدمؑ پر فضیلت رکھتے ہیں!

اب آدمؑ کو اپنے عمل سے اس دعویٰ کا جواب دینا ضروری تھا اس لیے کہ جب تک آدم عشقِ الٰہی میں ملائکہ پر اپنا تفوق ثابت نہ کرتے تب تک وہ مسجود ملک قرار دیے جانے کا استحقاق ثابت نہیں کر سکتے تھے۔

اور آدمؑ نے زمین پر اترتے ہی عشقِ الٰہی کا امتحان دینا شروع کر دیا۔ —— عرش کی ٹھنڈی چھاؤں میں انوارِ الٰہیہ کا مشاہدہ کرتے ہوئے عبادت کرتے رہنا اور جنّت کی پُر سکون وادیوں میں تسبیح و تہلیل کی صدائیں بلند کرتے رہنا آسان کام ہے لیکن چالیس سال تک مسلسل اشک فشانی کرتے رہنا محبوب حقیقی سے دور ہو جانے پر تڑپتے پھڑکتے رہنا اور لنکا سے مکّہ تک محض عشق کی رہنمائی میں دور دراز کی بادیہ پیمائی کرتے ہوئے سر زمین کعبہ تک جا پہنچنا یہ آدمؑ ہی کے عشق الٰہی کا کمال تھا، شاید ملائکہ کے دعوائے عشق کا یہ مکمل جواب ہوتا، لیکن آدمؑ خاکی کی فطرت اِس جواب پر مطمئن نہیں ہو سکتی تھی۔

آدمؑ تو یہ چاہتے تھے کہ طوفان کی لہریں نوحؑ کی شکل میں اُن کے عشق کی گواہی دیں، آگ کے لپکتے ہوئے شعلے ابراہیمؑ کے پیکر میں ان کے عشق کے شاہد ہوں اور نیل کا دھارا موسیٰؑ کے رُوپ میں ان کے عشق کی شہادت دے، فلک چہارم پر مسیحؑ کا ورود

ان کی پرواز عشق کا ثبوت بنے اور منزل لامکان محمدؐ کے قدم چوم کے یہ اعلان کرے کہ آدم خاکی کا ذوق لقائے باری اسے وہاں تک لے جا سکتا ہے جہاں جبرئیل سے ملک مقرب کے قدم بھی تھک جاتے ہیں اور وہ پکار اٹھتا ہے:

اگر یک سر موئے برتر پرم فروغ تجلّی بسوزد پرم

اس میں شبہ نہیں کہ اولاد آدمؑ نے عشقِ الٰہی کے ایسے ایسے مظاہرے کیے ہیں کہ ان کے مقابلے میں ملائکہ کی عبادت و تسبیح کی کوئی حقیقت نہیں، لیکن سرزمین کربلا پر تو آدمؑ کے ایک فرزند نے عشق و اطاعت کا وہ زندہ جاوید مظاہرہ کیا ہے جس کے بعد آدمؑ یقیناً ملائکہ کے مقابلے میں فخر کا تاج کج کر سکتے ہیں اور پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ:

"اے بزمِ فلک کے رہنے والو! تم عشق و اطاعت کی بنیاد پر میرا مقابلہ کرنا چاہتے تھے؟ اپنی تسبیح و تہلیل کی اساس پر میرے استحقاق خلافت کو چیلنج کر رہے تھے؟ تمہیں بڑا ناز تھا اپنی عبادت اور محبت پر؟ تو اب دیکھو اس مظاہرۂ عشق کو جو سرزمینِ کربلا پر کیا گیا ہے! کیا اب بھی تمہاری مجال ہے کہ تم میرے مقابلے میں عشق الٰہی کے مدّعی بن سکو؟

ہمّت ہے تم میں کہ اللہ کے لیے گھر بار چھوڑ دو، اعزاء و انصار سے منہ موڑ لو، جنگل جنگل کی خاک چھانو، تین دن کی بھوک اور پیاس کے صبر آزما امتحان سے گذرو، دوستوں کے سر کٹتے دیکھو، عزیزوں کو ——— خاک و خون میں تڑپتے دیکھو، جوان بیٹا سینے پر برچھی کھائے اور زبان پر اُف نہ آئے، کڑیل جوان بھائی کے بازو کٹ جائیں، سر پاش پاش ہو جائے اور آنکھوں میں نمی نہ آئے،

بھتیجے کی لاش پامالِ سمِ اسپاں ہو جائے اور پائے ثبات میں لغزش نہ ہو، چھ ماہ کا بچہ ہاتھوں پہ ذبح ہو جائے اور رضآءً بقضآءہٖ وتسلیماً لامرہٖ کے سوا کوئی جملہ زبان پر نہ آئے، جسم تیروں سے غربال ہو جائے اور عشق کی آن پر حرف نہ آئے اور موت سے ہمکنار ہو تو اس شان سے کہ سر سجدۂ خالق میں ہو، زبان پر تسبیح کے الفاظ ہوں اور دل ان کیفیاتِ عشق سے معمور ہو جن میں چاہنے والا اپنی ذات کو محبوب کی ذات میں اس طرح گمُ کر دیتا ہے کہ حبیب و محبوب کے مابین کوئی حد فاصل قائم کرنا دشوار ہو جاتا ہے!

واقعہ یہ ہے کہ سرزمین کربلا پر جو کچھ ہوا وہ صرف عشقِ الٰہی کا کارنامہ تھا۔ اللہ کا ایک چاہنے والا، ایک سچا عاشق مدینہ میں خاموشی کی زندگی گذار رہا تھا، اسے نہ حکومت کی طلب تھی نہ زروجواہر کی آرزو، نہ عہدوں کی فکر تھی نہ مناصب کی تلاش، نہ عیش کی تمنا تھی، نہ دنیا کی خواہش تھی۔ وہ جیتا تھا اللہ کے لیے، اور مرنا چاہتا تھا اللہ کے لیے، اس کے دل میں غمِ محبوب نے اتنی جگہ ہی نہ چھوڑی تھی کہ وہ کسی دوسری شے کی تمنا کرتا، اس کا سارا وقت اپنے محبوب کی یاد میں کٹتا تھا، اس کی ساری توجّہ اپنے محبوب کی خوشنودی پر مرکوز تھی، اسے اپنے محبوب کے علاوہ اور کسی سے سروکار نہ تھا۔

کہ اچانک اس دنیا میں بہت بڑا زلزلہ آیا، ایک خوفناک بھونچال ایک ہولناک طوفان، جس نے اس گوشہ نشین کی پُر سکون وادیٔ محبت میں ایک عظیم ہلچل پیدا کر دی، شیطان نے دمشق کے راج محل سے یہ اعلان کیا کہ وہ اس کے محبوب کے نام کو فنا کر دے گا، دنیا سے اللہ کے ذکر کو ہمیشہ کے لیے محو کر دے گا اور سلطنت کی قوتِ عساکر کے دباؤ اور سیم و زر کی طاقتوں سے کام لے کر اللہ کی سرزمین سے

اللہ کا تصوّر ختم کر دے گا۔ عاشق سب کچھ برداشت کر سکتا ہے لیکن اپنے محبوب پر حملہ ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔

چنانچہ یہ جانباز و سرفروش عاشقِ الٰہی شیطان کے مقابلے پر آمادہ ہوگیا، امتحان گاہ وفا کی راہ سخت بھی تھی اور پُر پیچ بھی، عشق نبرد پیشہ قربانیوں کا طالب تھا، اس راہ میں جان سے کھیلنا اور موت سے بازی لگانا ضروری تھا، لیکن عشق مشکلات کی پروا نہیں کرتا، مصائب سے کبیدہ خاطر نہیں ہوتا، قربانیوں سے نہیں ہچکچاتا اور جان پر کھیل جانا بازی طفلانہ دل تصوّر کرتا ہے۔ اس لیے حسینؑ نے بھی عواقب کا خیال نہیں کیا۔ سلامتی کے تصورات کو دل سے محو کر دیا اور اپنے عشق کا امتحان دینے کے لیے میدان میں آگئے۔

شیطان اب تک بہت سے عاشقانِ الٰہی کو امتحان میں ڈال چکا تھا، اور اس مرتبہ وہ سخت ترین امتحان کی ناکامی پر تُلا ہوا تھا، لیکن یہ اس کی بھول تھی، اب عشقِ الٰہی کا وہ متوالا میدان میں آرہا تھا، جو آدمؑ و نوحؑ و ابراہیمؑ و موسیٰؑ و عیسیٰؑ و محمدؐ کی مسندِ عشق کا وارث تھا، جسے ان اولیاء اللہ کی ساری روایات محبّت ورثہ میں ملی تھیں، جس کی پشت پر محبّت الٰہی کی ایک عظیم مگر، خونیں تاریخ موجود تھی، اور جس کے عشق کی گہرائیوں کا اندازہ کرنا عقلِ بشری کے لیے قطعاً محال تھا۔

منزلِ عشق میں جتنے امتحان ممکن ہو سکتے تھے وہ سب ایک ساتھ دے ڈالنے پر آمادہ تھا، عشق خانہ بربادی کا طالب ہو تو وہ مدینہ چھوڑ دینے پر تیار تھا، دشتِ بلا میں صحرانوردی کا طالب ہو تو ریگ زارِ عرب میں آبلہ پائی پر تیار تھا، بھوک اور پیاس کا امتحان درکار ہو تو تین دن کی بھوک پیاس پر تیار تھا، خونِ معصوم کا

طالب ہو تو شش ماہہ کی موت پر تیار تھا، جراحتِ جسمانی کا طالب ہو تو جسم پر دو ہزار زخم کھانے کو تیار تھا، موت کا طالب ہو تو پسِ گردن سے گلا کٹانے پر تیار تھا، مالی قربانی کا طالب ہو تو خیام کے جلنے اور لٹنے پر تیار تھا، آبرو کا طالب ہو تو بہنوں اور بیٹیوں کی اسیری پر تیار تھا۔

غرض عشقِ الٰہی کی خاطر وہ سب کچھ کرنے پر تیار تھا جس کا تصوّر بھی بزمِ فلک کے ساکن نہیں کر سکتے، چنانچہ اس نے ریگ زار کربلا پر وہ امتحانِ عشق دیا جس کی نظیر رہتی دنیا تک ملنا محال ہے، اس نے اپنی قربانی سے آدمؑ کا نام اونچا کر دیا، بنی آدم کا نام اونچا کر دیا اور دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ اگر تسبیح و تقدیس کے نام پر ملک عشقِ الٰہی کا مدعی ہے تو انسان اپنے خون کی دھاروں سے عشق کی تاریخ مرتب کرنے پر تیار ہے۔

ملک صرف تسبیح خوانی کر سکتا ہے، انسان محبوب حقیقی پر جان قربان کر سکتا ہے، ملک مصلّی بننا جانتا ہے، بنی آدم شہید کہلانے کو معراجِ عشق تصوّر کرتا ہے۔ ملک عرش کے سائے میں یادِ الٰہی کر سکتا ہے اور فرزندِ آدمؑ شش ماہہ کی خون آلودہ میت ہاتھوں پر لے کر اللہ کو یاد کرنا جانتا ہے۔ ملک صرف اطاعت کرنا جانتا ہے انسان عشق کرنا جانتا ہے، ملک زیادہ سے زیادہ محبوبِ حقیقی کے احکام پورے کر کے ایک خادم کی حیثیت حاصل کر سکتا ہے، انسان مظاہرۂ عشق سے محبوب کا دل جیتنا چاہتا ہے، اور اس اعتبار سے ملک اور انسان میں جو فرق پیدا ہوتا ہے وہ وہی ہے جسے عادلِ حقیقی نے آدمؑ کو مسجودِ ملائکہ قرار دے کر روزِ اوّل ظاہر فرما دیا تھا!

حسینؑ کی شہادت نے دنیا کو منشائے تخلیقِ آدم سے روشناس کیا۔ اگر قدرت کو صرف ایک اطاعت گذار، تسبیح خوان، خادم کی ضرورت ہوتی تو ملائکہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے کم نہ تھے، بات تو دراصل یہ تھی کہ فطرتِ محبوبی کثرتِ خدام سے مطمئن نہیں ہوتی، محبوب خادم کا طالب نہیں

ہوتا، عاشق کا طالب ہوا کرتا ہے، اسے خدمت در کار نہیں ہوتی، عشق در کار ہوتا ہے، ملک خدمت تو کر سکتے تھے لیکن محبوبِ حقیقی کی یاد میں اشک و آہ کا طوفان برپا کر دینا، اختر شماریوں میں راتیں کاٹ دینا، محبوب کی خاطر دنوں کا چین اور راتوں کی نیند حرام کر لینا، جنگل جنگل کی خاک چھاننا محبوب کے نام پر تلواروں پر گلے رکھ دینا، محبت کی خاطر آگ اور خون کے دریاؤں میں بے فکری سے کود جانا، لہو کے دھاروں سے افسانۂ عشق کو آب و رنگ عطا کر دینا ملک کا کام نہیں تھا، اس کے لیے تو اس آدم کی ضرورت تھی جس کے سینے میں دل تھا اور دل میں لذتِ غم، محبوبِ حقیقی کو اسی دل کی ضرورت تھی جو ٹوٹتا ہے تو خود نگاہِ آئینہ ساز میں قیمتی ہو جاتا ہے اور خون خون ہوتا ہے تو دربارِ الٰہی میں مکرّم بن جاتا ہے۔

فطرتِ محبوبی کو یہی عشق در کار تھا اور اس عشق کا آدمؑ کے ایک فرزند حسینؑ نے جو تابناک مظاہرہ کیا ہے، اس کی داد ہم تو خیر کیا دیں گے، ہاں وہ عظیم المرتبت محبوب، وہ حسن مطلق ہی دے سکے گا، جس کے عشق کی بے پناہی نے حسینؑ کو اس منزل پر پہنچا دیا ہے، جہاں خود یہ عاشقِ الٰہی عقلِ بشری سے ماوریٰ نظر آ رہا ہے۔

آنسو

دنیا کے تمام حق پرستوں کی یاد کو قائم رکھنا نہ صرف یہ کہ ہر سچے انسان کا فرض ہے بلکہ شاید یہ انسانی فطرت میں داخل ہے چنانچہ دنیا کا کونسا ملک ہے، کون سی قوم ہے، کون سی جماعت ہے جو حق پرستاروں کو یاد نہیں کرتی؟ حق پر مر مٹنے کی یادگاریں قائم نہیں کرتی؟ اور ان سے اپنی عقیدت و محبت کے اظہار کے مختلف ذرائع اختیار نہیں کرتی؟ عیسائی مسیحؑ کی بارگاہ قدس میں اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں، ہندو رام اور کرشن کے چرنوں میں شردھا کے پھول چڑھاتے ہیں۔ مسلمان میلاد الرسولؐ کی تقریب دھوم دھام سے مناتے ہیں فرانسیسی جون آف آرک کی تصویریں گھروں میں رکھتے ہیں، انگریز نیلسن کے مجسمہ پر ہار پھول چڑھاتے ہیں، روسی لینن کے مقبرہ کی زیارت کرتے ہیں، غرض دنیا کی ہر قوم ہر ملک اور ہر مذہب کے لوگ ان بزرگوں کی یادگار مناتے ہیں جن کے متعلق ان کو یقین ہے کہ انھوں نے حق، انصاف اور انسانیت کی خدمت انجام دی ہے، حسینؑ بھی ایسے ہی بزرگوں میں شامل ہیں اس لیے کہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں حسینؑ کی یادگار بھی منائی جاتی ہے اور مزہ کی بات تو یہ ہے کہ صرف مسلمان ہی حسینؑ کی یادگار نہیں مناتے، دوسرے فرقوں کے لوگ بھی اس محسنِ انسانیت کی یاد منانے میں پورے جوش و خروش سے حصہ لیتے ہیں، ہندوستان کے لاکھوں ہندو حسینؑ کا تعزیہ رکھتے ہیں، حسینؑ کے نام پر شربت تقسیم کرتے ہیں، حسینؑ کی نیاز دلاتے ہیں، حسینؑ کا ماتم کرتے ہیں اور انسانیت کبریٰ

کے اس مظہرِ اتم سے عشق و عقیدت کا اظہار اپنے لیے واجب تصوّر کرتے ہیں آخر کیوں؟ حسینؑ سے نہ ان کا نسل کا رشتہ، نہ وطن کا تعلق، نہ مذہب کی یکسانیت، نہ زبان کا اتحاد، لیکن پھر بھی یہ لاکھوں ہندو محرم آتے ہی کیوں بے چین ہو جاتے ہیں؟ —— وجہ صاف ظاہر ہے، ہندو یہ محسوس کرتے ہیں کہ مقدس ویدوں نے جس خدا پرستی کی تعلیم دی تھی حسینؑ اس کا مظہرِ اتم تھے، اپنشدوں نے انسان کامل کا جو عظیم تصوّر پیش کیا ہے، حسینؑ اس کی جیتی جاگتی تصویر تھے اور بھگوت گیتا نے "کرم" کی شکل میں نتائج سے بے پروا ہو کر ادائے فرض کا جو درس دیا ہے، حسینؑ اس کی مکمل اور جامع عملی تفسیر تھے، یہی وجہ ہے کہ ہندو حسینؑ سے غیریت یا اجنبیت محسوس نہیں کرتے، وہ نسل اور وطن کے اختلاف کے باوجود حسینؑ کو بالکل اپنا محسوس کرتے ہیں، ان کو حسینؑ کے رُوپ میں انسانیت کی وہ قدریں نظر آتی ہیں جو ابدی اور دائمی ہیں، جو نسل، وطن، مذہب، رنگ اور زبان کے اختلافات سے ماورا ہیں، جو زبان و مکان کی حدود سے بالاتر ہیں اور جن پر ہر زمانہ میں، ہر ملک اور ہر نسل کے لوگ فخر سے سر اونچا کرتے رہیں گے، یہی صورت دوسرے مذاہب والوں کے سلسلہ میں بھی ہے جو حق اور انسانیتِ کبریٰ کی خاطر حسینؑ سے عشق و ارادت کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں اور جس کے نتیجہ میں حسینؑ کی یادگار کو ایک بین الاقوامی حیثیت حاصل ہو گئی ہے!

دوسرے بزرگوں کی بھی یادگار منائی جاتی ہے اور حسینؑ کو بھی یاد کیا جاتا ہے لیکن حسینؑ کی یادگار کی شکل اور اس کا انداز دوسرے بزرگوں کی یادگار سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس پر کچھ روشنی ڈالنا ضروری تصوّر کرتا ہوں!

دوسرے بزرگوں کی یادگاریں ہمیشہ خوشی اور مسرّت کے ہجوم میں منائی جاتی ہیں۔ عیسائیوں کا کرسمس، ہندوؤں کا دسہرہ، یا جنم اشٹمی، مسلمانوں کی عید میلاد اور پارسیوں کا جمشید نوروز، ان مذاہب کی بزرگوں کی یادگاریں ہیں

لیکن یہ سب یادگاریں خوشی اور انبساط کی پیامی ہوتی ہیں، ناچ رنگ اور عیش و مسرت کی داعی ہوتی ہیں اور ان کو خوشی کے تہواروں سے موسوم کیا جاتا ہے، دنیا کے تمام مذاہب میں، تمام قوموں میں جتنے بھی تہوار ہوتے ہیں وہ سب خوشی اور مسرت کے پیامبر ہوتے ہیں، لیکن حسینؑ کی یادگار خوشی کے قہقہوں سے نہیں غم کے آنسوؤں سے منائی جاتی ہے اور یہ ایک ایسی چیز ہے جو حسینؑ کی یادگار کو دوسرے تمام بزرگوں کی یادگاروں سے ایک جداگانہ صورت عطا کر دیتی ہے۔

حسینؑ کی یاد میں لوگ روتے کیوں ہیں؟ ہنستے کیوں نہیں؟ اس کا کوئی منطقی جواب میرے پاس نہیں ہے! میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک معجزہ ہے اور چونکہ حسینؑ کے گھر والوں کو حسینؑ کی میت پر رونے کی اجازت نہیں دی گئی تھی اس لیے قدرت نے حسینؑ کو اس مظلومی کا یہ بدلہ دیا ہے کہ آج تک ان کی یاد آنسوؤں سے منائی جاتی ہے۔ میں نے اس کے لیے لفظ "معجزہ" استعمال کیا ہے اور میں حسینؑ پر رونے کو واقعی معجزہ تصور کرتا ہوں۔

سوال یہ ہے کہ "معجزہ" کسے کہتے ہیں؟ معجزہ کے معنی ہیں، ایسا واقعہ جس کا کوئی عقلی، منطقی یا سائنٹیفک سبب تو بیان نہ کیا جا سکے لیکن پھر بھی وہ واقعہ ظہور میں آئے۔ حسینؑ پر رونا بالکل اسی قسم کا واقعہ ہے، عقلی اعتبار سے یہ قطعاً ناممکن ہے کہ ہم ایک ایسے انسان پر، جس سے نہ تو ہماری کوئی رشتہ داری ہو اور نہ کوئی تعلق، اور پھر اس انسان کو شہید ہوئے تیرہ سو سال ہو چکے ہوں، روئیں اور اتنا روئیں کہ روتے روتے بے ہوش ہو جائیں، ہم اپنے دادا پر تو رو نہیں سکتے جن کا خون ہماری رگوں میں موجود ہے اور جن کو مرے سو سال سے زیادہ نہیں ہوئے پھر ایک ایسے انسان پر کیسے رویا جا سکتا ہے جس سے عزیز داری بھی نہ ہو اور اسے مرے ہوئے تیرہ صدیاں بھی بیت چکی ہوں؟ عقل کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ عقل کی خاموشی کے باوجود لوگ حسینؑ پر روتے ہیں اب اسے معجزہ نہ کہا جائے تو پھر اور کیا کہا جا سکتا ہے!

مانا کہ واقعہ درد انگیز ہے، قربانی عظیم المرتبت ہے اور انسانی ہمدردی کا یہ اقتضٰی ہے کہ جب ایک دردناک واقعہ سنا جائے تو اس پر آنکھوں میں آنسو آجائیں لیکن فطرت انسانی کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ وہ ایک ہی واقعہ سے دو چار مرتبہ تو متاثر ہو سکتی ہے، بار بار اسی واقعہ کو سنایا جائے تو پھر ہرگز اس کا اثر باقی نہیں رہ سکتا، ایک ٹریجڈی پڑھ کے پہلی بار ہم رو دیں گے، دوسری اور تیسری بار متاسف ہوں گے لیکن دس پندرہ بار سننے کے بعد اس میں درد کا کوئی پہلو ہمارے لیے باقی نہیں رہے گا۔ لیکن حسینؑ کی داستان لوگ ہزاروں بار سنتے ہیں، محرم میں دن رات سنتے ہیں، اس کے بعد بھی تقریباً سال بھر مجالس کا سلسلہ جاری رہتا ہے جس میں حسینؑ کا واقعہ سنا جاتا ہے اور پھر ہر مرتبہ لوگ اس واقعہ پر روتے ہیں اس کا درد و اثر کبھی ختم نہیں ہوتا، اس غم میں بار بار سننے کے باوجود کوئی کمی نہیں آتی بلکہ لوگ جتنا زیادہ اس واقعہ کو سنتے ہیں اتنا ہی زیادہ حسینؑ پر روتے ہیں، نفسیاتی اور عقلی اعتبار سے یہ ناممکن سی چیز ہے ——— ——— لیکن پھر بھی یہ ناممکن شے روزانہ ہمارے مشاہدے میں آتی ہے اور غم حسینؑ کو ایک اعجاز کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کرتی رہتی ہے!

غم کے متعلق یہ نفسیاتی کلیہ ہے کہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ختم ہو جاتا ہے بیٹا مر جائے تو ماں باپ کے غم کی کوئی تھاہ نہیں ہوتی، وہ روتے ہیں، تڑپتے ہیں، چیختے ہیں اور اپنے درد انگیز جملوں سے، اپنے بین سے دوسروں کا کلیجہ بھی ہلا دیتے ہیں، لیکن دو چار سال بیت جانے کے بعد اسی بیٹے کی موت پر ان کی آنکھ سے ایک آنسو بھی جاری نہیں ہوتا، وہ صرف ایک ہلکی سی آہ اور دبی دبی سسکی لے کر خاموش ہو جاتے ہیں، دس یا بارہ سال گذر جائیں تو پھر یہ کیفیت بھی باقی نہیں رہتی اور وقت کا مرہم ان کے زخم دل کو پورے طور پر مندمل کر دیتا ہے ——— ایسی حالت میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تیرہ سو سال کے بعد بھی لوگ حسینؑ پر روتے ہیں، دھاڑیں مار مار کر روتے ہیں، روتے روتے بے ہوش ہو جاتے ہیں تو کم سے کم نفسیات کا فلسفہ اس کی کوئی عقلی توجیہہ پیش کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے، اس کی کوئی سائنٹیفک یا

منطقی دلیل پیش نہیں کی جا سکتی، ہماری عقل اس موقع پر حیران ہو جاتی ہے۔ لیکن عقل، منطق، سائنس اور نفسیات کے تمام اصولوں کو توڑ دینے والا یہ واقعہ ساری دنیا میں ہر جگہ ظہور میں آتا ہے اور محرم میں طول و عرض عالم میں ہر مجلس میں دیکھا جا سکتا ہے، اسے معجزہ نہ کہا جائے تو کیا کہا جا سکتا ہے!

نفس انسانی کا یہ مسلّمہ اصول ہے کہ انسان غم سے دور بھاگتا ہے اور مسرتوں میں کھویا رہنا چاہتا ہے، غم کی مجلس برپا کرنا، ان پر ہزاروں روپیہ خرچ کرنا، لوگوں کا ان میں ذوق شوق سے شرکت کرنا، رونا، ماتم کرنا، سر و سینہ پیٹنا اور پھر ایک مجلس سے اٹھ کر دوسری مجلس میں جانا، وہاں سے تیسری اور چوتھی مجلس میں پہنچنا دن دن بھر مجالس میں شرکت کرتے رہنا، ہر جگہ جا کے رونا اور اس رونے میں ایک لذت محسوس کرنا، عقل اور نفسیات کے کسی اصول سے امر واقعہ ثابت کیا جا سکتا ہے؟ لیکن یہ خلافِ عقل حقیقت روزانہ مجالس حسینؑ کے سلسلہ میں دیکھی جا سکتی ہے، زندگی کی کوئی منزل ہو، بچپن ہو یا جوانی، ادھیڑ پن ہو یا بڑھاپا، حالات اچھے ہوں یا بُرے، انسان دولت میں کھیل رہا ہو یا افلاس کا مارا ہوا ہو، تاجر ہو یا صناع، بیرسٹر ہو یا انجینئر، جسے دیکھیے اور جب دیکھیے حسینؑ کی مجلس میں موجود ہے، رو رہا ہے، آنسو بہا رہا ہے، چیخ رہا ہے اور والہانہ انداز میں سر و سینہ پیٹ رہا ہے!

—— آخر کیوں؟ اس سے ان لوگوں کو کیا فائدہ ہے؟ ان کی حسینؑ سے کونسی عزیز داری ہے؟ کیا تعلق ہے؟ لیکن پھر بھی یہ لوگ روتے ہیں، میں خود روتا ہوں، اور بغیر کسی منطقی دلیل کے اور بغیر کسی نفسیاتی توجیہہ کے روتا ہوں!

—— ایسی حالت میں اسے معجزہ نہ کہوں تو کیا کہوں؟ —— اور حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ معجزہ ہے، یہ خدا کی جانب سے حسینؑ کی مظلومیت کا انعام ہے، یہ ان آنسوؤں کی قیمت ہے جو حسینؑ کے گھرانے کی خواتین کی آنکھوں میں لہرائے تو تھے لیکن لشکر عمر سعد کے مظالم کے نتیجہ میں دامن تک نہ آ سکے تھے، آلِ رسولؐ کی عورتیں حسینؑ اور ان کے بچوں پر رو نہیں سکی تھیں، علی بن الحسینؑ اپنے باپ اور

بھائیوں پر ایک آنسو بھی نہیں بہا سکے تھے اس لیے کہ دشمن کا یہ حکم تھا کہ ان لوگوں کو رونے کی اجازت نہ دی جائے، اگر کسی کی آنکھ سے ایک آنسو بھی ٹپک جاتا تھا تو اسے درے مارے جاتے تھے اور کوڑوں سے اس کی پیٹھ لہولہان کر دی جاتی تھی، یزید نے چاہا کہ حسینؑ پر کوئی نہ رونے پائے، قدرت نے اس کے جواب میں یہ فیصلہ کیا کہ حسینؑ پر ساری دنیا روئے، ایک دو دن نہیں، سینکڑوں سال روئے، یزید کا حکم مٹ گیا قدرت کا منشا جاری ہے چنانچہ آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں لاکھوں آدمی حسینؑ پر روتے ہیں، حسینؑ پر رونے کے لیے مجلسیں برپا کرتے ہیں، ان مجلسوں پر لاکھوں روپیہ خرچ کرتے ہیں اور حسینؑ کے غم میں کچھ ایسی لذت محسوس کرتے ہیں کہ اسے باقی رکھنے کی خاطر اپنی جانیں تک قربان کر دینے پر تیار ہیں!

دنیا میں ہزاروں بزرگ اور ولی گذرے ہیں، پیغمبر اور رشی تشریف لائے ہیں اور ان سب نے اپنی اپنی زندگی میں ہزاروں معجزات دکھائے ہیں، کسی نے مردوں کو زندہ کیا تو کسی نے بیماروں کو اچھا کیا، کسی نے آگ کو گلزار کیا، تو کسی کے لیے دریا شگافتہ ہو گیا، لیکن یہ معجزات ظہور میں آئے اور ان بزرگوں کے ساتھ ہی ختم ہو گئے۔ آج صرف ان کی داستان موجود ہے، اور اگر کوئی مادہ پرست ان معجزات سے انکار کر دے تو مذہب پرست دنیا کے لیے ان کا ثابت کرنا حد درجہ دشوار ہے ——— لیکن حسینؑ کا معجزہ آج بھی زندہ ہے اور آنسوؤں کی شکل میں سینکڑوں برس سے ہماری نگاہوں کے سامنے موجود ہے! ——— پھر، دوسرے معجزات کسی ایک خاص سرزمین تک محدود رہے ہیں، موسیٰؑ کے معجزات وادیٔ نیل تک، مسیحؑ کے معجزات یروشلم تک، ابراہیمؑ کا معجزہ بابل تک، دوسرے ممالک میں ان کا کوئی اثر نہیں دیکھا گیا، لیکن حسینؑ کا معجزہ ساری دنیا میں دیکھا جا سکتا ہے عراق ہو یا ایران، انڈونیشیا ہو یا ملایا، چین ہو یا ہندوستان، مصر ہو یا مراکش، پاکستان ہو یا افغانستان، محرم آتے ہی دنیا کے ہر ملک میں حسینؑ کی صفِ ماتم بچھتی ہے، لوگ حسینؑ پر روتے ہیں، اور اس طرح یہ زندہ معجزہ اطراف واکنافِ عالم

ہیں اپنی جلوہ گری سے ہماری عقلوں کو حیران کر دیتا ہے !

اس سلسلے میں یہ چیز قابلِ غور ہے کہ صدیوں تک حسینؑ پر رونا حکومت کے نزدیک ایک انتہائی خطرناک "جرم" بنا رہا ہے۔ حسینؑ پر رونے والے قتل کیے گئے، لوٹے گئے، جلا وطن کیے گئے، دیواروں میں چُنے گئے، تاریک کوٹھڑیوں میں قید کیے گئے لیکن اس جبر و تشدد کے باوجود حسینؑ کا ماتم جاری رہا، لوگ موت قبول کرتے رہے، اپنی تباہی و بربادی قبول کرتے رہے لیکن حسینؑ پر روتے رہے اور حکومت کا سارا تشدد حسینؑ پر بہنے والے آنسوؤں کو روکنے میں ناکام رہا ——— یہی نہیں بلکہ حکومت کے وظیفہ خوار مولوی حسینؑ پر رونا حرام اور بدعت قرار دیتے رہے۔ حسینؑ پر رونے والوں کو جہنم کا خوف دلاتے رہے، حسینؑ کے ماتم داروں کو "کافر" کا لقب دیتے رہے، اور اپنی ساری تقریری، تحریری اور علمی قوتیں اس چیز پر مرکوز کیے رہے کہ حسینؑ کا ذکر، حسینؑ کا ماتم اور حسینؑ پر رونا بند ہو جائے لیکن جس طرح حکومت کی طاقت حسینؑ پر رونا بند کرانے میں ناکام رہی اُسی طرح مولوی صاحبان کا "جوشِ جہاد" بھی اس ذکر کو فنا کرنے میں ناکام ثابت ہوا۔ یہ مہم دو چار سال نہیں بلکہ صدیوں تک جاری رہی، اور آج بھی جاری ہے، خود ہمارے ملک (ہندوستان) میں جب تک مسلم حکومت رہی، تب تک حکومت ذکرِ حسینؑ دبانے میں کوشاں رہی، جب سے حکومت نہیں رہی تب سے آج تک مولوی صاحبان کی مہم جاری ہے، اب اگر اس "دینی و دنیاوی تشدد" کے باوجود حسینؑ کا ذکر قائم رہتا ہے گھروں سے "حسینؑ حسینؑ" کی آوازیں بلند ہوتی ہیں اور حسینؑ کے غم میں، آنسوؤں کی گنگا جمنا بہتی رہتی ہے تو اسے معجزہ نہیں کہیئے گا تو پھر اور کیا کہیئے گا ؟

مجھے تعجب ہے کہ لوگ یہ زندہ معجزہ دیکھتے ہیں اور پھر اس پر ایمان نہیں لاتے ——— میرا خیال ہے کہ مسلمانوں ہی کو نہیں، دنیا کے تمام مذہب پسند انسانوں کو اس زندہ معجزہ پر فخر کرنا چاہیے، لامذہبوں کے مقابلہ میں اسے پورے شد و مد کے ساتھ پیش کرنا چاہیے ! ان سے پوچھنا چاہیے کہ بھلا عقل اور نفسیات کے

کس اصول کے ماتحت یہ واقعہ ظہور پذیر ہوتا ہے ؟ اس کی سائنٹیفک توجیہہ کیا ہو سکتی ہے ؟ اور کیا ممکن ہے کہ تیرہ سو سال قبل مرنے والے ایک انسان کے غم میں ساری دنیا اس طرح رویا کرے جس طرح حسینؑ پر رویا کرے ؟ ـــــ مجھے یقین ہے کہ ، ان سوالات کا مادہ پرستوں اور لامذہبوں کی جانب سے کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا اور وہ اس حقیقت کی موجودگی میں مذہب کی صداقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں !

اگر یہ کہا جائے کہ حسینؑ کے ماننے والے مذہبی جوش اور اپنے رہنما سے گہری عقیدت اور محبّت کے نتیجے میں حسینؑ پر آنسو بہاتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ کیا ہندوؤں کو رام اور کرشن سے محبّت نہیں ، کیا عیسائیوں کو مسیحؑ سے سچی عقیدت نہیں ، کیا سکھوں کو گورو نانک سے عشق نہیں ؟ کیا مسلمانوں کو رسول اللہؐ سے والہانہ وابستگی نہیں ؟ اور کیا کمیونسٹوں کو مارکس اور لینن سے شدید انس نہیں ـــــ ؟ اگر ہے تو پھر مسیح کے صلیب پانے پر عیسائی کیوں نہیں روتے ، گورو نانک کے مصائب پر سکھ کیوں نہیں آنسو بہاتے ، اپنے بزرگوں کی یاد میں ہندو اور مسلمان کیوں نہیں تڑپتے ، مارکس اور لینن کے غم میں کمیونسٹ اشک افشانی سے کیوں قاصر رہتے ہیں ؟ یہ حسینؑ ہی پر کیوں آنسو نکلتے ہیں ؟ یہ دنیا کی ہر قوم اور ہر مذہب کے لوگ حسینؑ ہی پر کیوں روتے ہیں ؟ یہ عقیدت کی کونسی قسم ہے جس کا مظاہرہ صرف حسینؑ کے سلسلہ میں ہوتا ہے ؟ مجھے یقین ہے کہ اس کا کوئی معقول جواب ممکن نہیں ہے ، جواب اگر کچھ ہے تو یہی کہ یہ آنسو معجزہ ہیں ، یہ رونا معجزہ ہے اور حسینؑ اپنی موت کے بعد بھی ایک ایسا اعجاز چھوڑ گئے ہیں جو دنیا کو حقانیت ، روحانیت اور مذہب کی صداقتوں کی جانب رہنمائی کرتا رہتا ہے !

غمِ حسینؑ

حسینؑ پر رونے کی مخالفت بنی امیہ کے ہوا خواہوں کا محبوب مشغلہ ہے، صدیاں بیت گئیں لیکن یہ مخالفت جاری ہے اور مزہ کی بات یہ ہے کہ اس مخالفت کا اتنا بھی اثر نہیں ہوتا کہ ایک رونے والا بھی اس کے نتیجہ میں حسینؑ پر رونا ترک کر دے، رونے کے خلاف لاکھوں تقریریں کی گئیں، ہزاروں کتابیں لکھ ڈالی گئیں، دفتر کے دفتر سیاہ کر دیے گئے، فتاوئے کے انبار لگا دیے گئے، لیکن نہ اشک افشانیوں میں کمی پیدا ہوئی، نہ سینہ کوبیوں میں قصور ہوا، نہ اشک و آہ کے طوفان تھمے اور نہ نالہ و شیون کی صدائیں بند ہو سکیں ——
شاید اس لیے کہ قدرت حسینؑ کے اس زندہ معجزہ کو باقی رکھنا چاہتی ہے، یا شاید اس لیے کہ رونے کے خلاف جو باتیں کہی جاتی ہیں وہ اتنی بے بنیاد، اتنی مہمل، اتنی بے اثر اور اتنی خلافِ فطرت ہوتی ہیں کہ ان کا اثر نہ ذہن قبول کرتا ہے اور نہ قلب بنی امیہ کے طرف داروں کی زبان سے الفاظ نکلتے ہیں اور فضا میں بکھر جاتے ہیں، کاغذ کی سطح پر ان کے قلم کی جولانیاں نمودار ہوتی ہیں اور کتابوں کے گورستان میں دفن ہو جاتی ہیں، نہ ان کا اثر دل لیتے ہیں نہ دماغ، اور دنیا ہمیشہ ہلال محرم نمودار ہوتے ہی حسینؑ حسینؑ کی صداؤں سے گونج اُٹھتی ہے! —— رونے کے خلاف ایک دلیل بڑے شد و مد سے یہ لائی جاتی ہے کہ رونا بزدلی کا مظاہرہ ہے، قلب کی کمزوری کا اظہار ہے اور اس اعتبار سے بہادر انسانوں کے شایانِ شان نہیں کہا جا سکتا!

ایک پرانی اور فرسودہ دلیل، نفسیاتی اعتبار سے کمزور اور حقیقت کے نقطہ نظر سے قطعاً دور از کار! —— قدرت نے ہر چیز کا ایک محل، ایک مقام اور ایک موقع قرار دیا ہے، جو چیز اس کے محل سے ہوگی درست سمجھی جائے گی، جو کام بے محل کیا جائیگا

غلط قرار دیا جائے گا۔ رونا، ہنسنا، چلنا، پھرنا، کھانا، پینا، بولنا، باتیں کرنا، لڑنا، میل کرنا، غرض دنیا کا کوئی فعل بذاتہٖ نہ اچھا ہے، نہ بُرا۔ محل اور موقع کے اعتبار سے اس کی صحت یا غلطی کا تعین کیا جاتا ہے۔ یہ علم الاخلاق کا ایک کلیہ ہے لیکن یزید کے طرفدار غم حسینؑ کی دشمنی میں اس کلیہ سے بغاوت کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کی ساری تقریریں بے اثر اور ساری تحریریں نکمی ثابت ہوتی ہیں، بات دراصل یہ ہے کہ اپنی مصیبت پر رو دینا بزدلی ہے اس لیے دنیا اس کی مخالفت کرتی ہے، دوسرے کی مصیبت پر بے چین ہو جانا شرافت، ہمدردی، گدازِ قلب اور رحم کی مثال ہے، اس لیے اس کی ہر شخص تعریف کرتا ہے، اپنی مصیبت پر مسکرا دینا صبر و شجاعت کہلاتا ہے، دوسرے کے مصائب پر مسکرا دینا شقاوت اور سنگدلی کا مظہر تصوّر کیا جاتا ہے، حسینؑ اپنی مصیبت پر رو دیتے، تو بزدل کہلاتے وہ مسکراتے ہوئے مصائب کا مقابلہ کرتے رہے، اس لیے صابر اور شجاع کہلائے ہم حسینؑ کے مصائب پر روتے ہیں تو یہ ہمارے رحم و شرافت، ہمارے گدازِ قلب اور ہماری نرم دلی کا مظہر ہوتا ہے، ہم ان مصیبتوں پر مسکرا دیں تو اسے ہماری شقاوت اور سنگدلی سے تعبیر کیا جائے گا، یہ ایک سیدھی سادی بات ہے، انسانیت اور شرافت کی بات ہے، حق کی بات ہے، انسانی فطرت سے قریب تر بات ہے اور یزید کے ہوا خواہ جب اس اخلاقی نظریہ کو، فطرت کے اس اصول کو، اخلاق و شرافت کے اس دستور کو نظر انداز کرتے ہوئے گریہ کی مخالفت کرتے ہیں، تو وہ ایک ایسی بات کہتے ہیں جسے نفسِ انسانی کسی حالت میں قبول نہیں کر سکتا، ذرا سوچیے تو کہ اپنی مصیبت پر رونا تو بزدلی ہے ہی، اب اگر دوسروں کی مصیبت پر رونا بھی غلط مان لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے، کہ قدرت کا وہ عجیب اور عظیم عطیہ جسے "آنسو" کہا جاتا ہے، قطعاً بے سود اور بے کار سی شے ہے اور قدرت نے ہماری آنکھوں میں محبت کے جو موتی چھپا رکھے ہیں وہ دراصل ایک فعلِ عبث ہے جو قدرت نے انجام دیا ہے!

فطرتِ انسانی کے خلاف کتنی بڑی بغاوت!! قدرت پر کتنا ہولناک الزام!!
کاش کہ یزید کے ہواخواہ غم کی اہمیت کو سمجھ سکتے۔

غم ہی وہ سرمایۂ انسانیت ہے جو دنیا کی ہر نیکی کی اساس ہے، جو دنیا کی ہر ترقی کی بنیاد ہے، جو انسانیت کے عز و شرف کا سرمایہ ہے، جو اس کائنات میں آدم کی سربلندی کا خزانہ اور مخلوقاتِ عالم انسان کے شرف کا گنجینہ ہے، اس کی قدر و قیمت کسی فلسفی سے پوچھیے، کسی شاعر سے دریافت کیجیے، کسی حکیم سے معلوم کیجیے، کسی خدا رسیدہ سے پوچھیے، وہ آپ کو اس نعمتِ لازوال کا مطلب سمجھائے گا اور بتلائے گا کہ ایک ٹوٹا ہوا دل ہی انسانیت کا وہ سرمایۂ عظمیٰ ہے جس کی اساس پر آدم مسجودِ ملک قرار پائے، روتی ہوئی آنکھیں ہی وہ نعمت تھیں، جنھوں نے طوفان میں نوحؑ کو سہارا دیا، یادِ الٰہی کی گرمی سے جلتے کلیجہ نے ہی نارِ نمرود کا مقابلہ کیا، اور انسانیت میں جتنا نکھار، جتنا حسن، اور جتنی دلکشی نظر آتی ہے وہ اسی رحم و ہمدردی، اسی شرافت و محبّت، اسی گداز و الفت، اور اسی رفعتِ اخلاق کا نتیجہ ہے جو ایک ٹوٹے ہوئے دل اور غموں سے نا چار قلب کا کارنامہ کہا جاتا ہے، انسان اگر حیوان سے ممتاز ہے تو رحم و کرم اور اخلاق و شرافت کی بنیاد پر، اور یہ صفاتِ عالیہ ممکن نہ ہوتیں اگر انسان کو لذتِ غم نصیب نہ ہوتی! ــــ مسرت کے قہقہے اور انبساط کے ترانے انسان میں دنائیت اور سطحیت پیدا کرتے ہیں، اس کی سنجیدگی اور بردباری کا خاتمہ کر دیتے ہیں، اس کے مزاج میں پستی اور اس کے افعال میں خفیف الحرکاتی پیدا کر دیتے ہیں، اسے انسانیت کی اعلیٰ اور بلند تر منزل سے نیچے اتار دیتے ہیں، اس کے برعکس غم انسان میں ترفع پیدا کرتا ہے، سنجیدگی اور بُردباری لاتا ہے، فکر کی قوتوں کو بیدار کرتا ہے، عمل کی صلاحیتوں کو جگاتا ہے، نیکی کی راہ دکھاتا ہے، اور انسان کو اس کے حقیقی شرف و منزلت سے ہمکنار کر دیتا ہے! ــــ یہ ہے وہ غم جس پر امویت کا پرستار ہنستا ہے اور ہم اس کے جواب میں محض اتنا ہی عرض کر سکتے ہیں کہ کاش تم بھی لذتِ غم سے آشنا ہوتے کاش تم بھی انسانیت کبریٰ کی اس نعمتِ لازوال سے مالا مال ہوتے! کاش کہ تم کو

ٹوٹے ہوئے دل کی منزلت معلوم ہوتی! تو تم شاید ہمارے رونے پر مسکراتے نہیں، اپنے مسکرانے پر آنسو بہانے پر مجبور ہو جاتے ـــــ کیا مزہ کی بات کہی ہے کسی نے ؎

دل لذتِ غم کی نعمت پر بے جا نہیں جتنا ناز کرے ـــــ مل جائے تو او ہنسنے والے تو ہم سے زیادہ ناز کرے

اور پھر حسینؑ کے غم میں بہنے والے آنسو! ـــــ اس سیلاب اشک کی قوت و سطوت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ بنی امیہ کی سلطنت، بنی عباس کا جاہ و جلال، اور نامعلوم کتنی جابر و ظالم حکومتوں کا ایوانِ اقتدار ان آنسوؤں میں بہہ گیا، حسینؑ کا نام مٹانے والے مٹ گئے لیکن آنسو کے ہر قطرہ میں حسینؑ کے روضہ اطہر کا عکس جمیل آج بھی صاف جھلکتا نظر آرہا ہے!

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مسرت عارضی شے ہوتی ہے اور غم نفسِ انسانی کی ایک پائیدار حقیقت ہے، خوشی کا اثر عارضی ہوتا ہے اور غم کے نقوش کافی گہرے ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جو یادگاریں مسرت کے ترانوں میں منائی جاتی ہیں وہ دل پر خاص اثر نہیں چھوڑتیں لیکن آنسوؤں کی شکل میں جو یادگار منائی جاتی ہے وہ روح پر بڑی شدت سے اثر انداز ہوتی ہے اور اس اعتبار سے ایک پائیدار اور مستحکم شے ہوتی ہے، حسینؑ کی یادگار کے سلسلہ میں یہ حقیقت عالم آشکار ہے، اس یادگار کو مٹانے کی ہمیشہ پُر زور کوشش کی گئی اور آج بھی کی جاتی ہے، لیکن حکومتوں کے جبر و تشدد، خونریزیوں اور قتل و غارت گری کے باوجود یہ یادگار آج تک قائم ہے اور زور شور سے منائی جاتی ہے۔ اور یہ سب اس لیے ہے کہ یہ یادگار آنسوؤں کی اساس پر قائم کی گئی تھی جو شدتِ جذبات کے بغیر آنکھوں سے نہیں نکل سکتے ہیں، جس یادگار میں اتنی شدید جذباتیت کو دخل حاصل ہو اسے ظاہر ہے کہ کوئی قوت نہیں مٹا سکتی تھی چنانچہ ہر قسم کا جبر ناکام رہا اور آنسوؤں کے سہارے اس حسینؑ کا نام آج بھی زندہ ہے جس کا نام مٹا دینے کی ہمیشہ پُر زور جد و جہد کی جاتی رہی ہے!

عزاداری

حضرت امام حسین علیہ السلام کی یاد میں ہندوپاکستان بھر میں تعزیئے رکھے جاتے ہیں، یہ تعزیئے دراصل حضرت کے روضہ کی شبیہہ ہیں اور انھیں دیکھ کر ہم معنوی اعتبار سے اس کربلا کی زیارت کر لیتے ہیں جہاں دنیائے حق پرستی کا سب سے بڑا اور سب سے عجیب مجاہد دائمی نیند سو رہا ہے!

نفسیاتی اعتبار سے یہ ضروری ہے کہ جب ہم کسی واقعہ پر اپنی تمام تر توجہات مرکوز کرنا چاہیں تو ایک ایسی چیز اپنے سامنے رکھ لیں جو ہمیں اس واقعہ کی جانب اشارہ کر سکتی ہو، کسی شے کو تازہ رکھنے اور پائیدار بنانے کیلئے یہ طریق عمل از حد مفید ہے اور کم از کم عوام اس کے بغیر کسی واقعہ کو پوری توجّہ کے ساتھ یاد نہیں رکھ سکتے۔ مثال کے طور پر ہم سب نے شاہجہاں کا نام سنا ہے لیکن زندگی کی مصروفیتوں میں ہم کتنی بار شاہجہاں کو یاد کر سکتے ہیں؟ ہاں جب تاج محل کی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے تو شاہجہاں کی یاد بھی ہمارے دل میں تازہ ہو جاتی ہے۔ اور جتنی دیر ہم اس تصویر کو دیکھتے رہیں گے اتنی دیر تک شاہجہاں کی لافانی محبت ہماری نگاہوں کے سامنے موجود رہے گی، مہا کوی کالیداس کے نام سے سبھی واقف ہیں لیکن یہ دعویٰ کون کر سکتا ہے کہ اسے ہر وقت کالیداس کا خیال رہا کرتا ہے؟ البتہ اگر "شکنتلا" سامنے رکھی ہو تو ذہن کا کالیداس کی جانب منتقل ہونا یقینی ہے، دور کیوں جایئے، اپنے گھروں میں دیکھیے کہ اپنے مرحوم ماں باپ کا دھیان کتنے لوگوں کو ہر وقت

رہا کرتا ہے؟ ہاں، جب ان کی کوئی تصویر، باپ کا کوئی پرانا خط، یا ماں کا کوئی زیور سامنے آجائے گا تو ذہن ضرور ان کی جانب متوجہ ہو جائے گا ـــــ ایسی حالت میں ذہن کو متوجہ کرنے کے لیے بیرونی یا خارجی محرکات کی ضرورت ناقابل انکار ہے۔ ممکن ہے کہ چند خاص ارباب علم جو ذہنی اعتبار سے اتنے پختہ ہوں کہ ان کو فوق البشر کہا جا سکے، کسی خارجی معاون کے بغیر، کسی واقعہ کو اس کی تمام جزئیات سمیت ہر وقت یاد رکھ سکتے ہیں، لیکن عوام کے لیے یہ ناممکن ہے، یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ہر قوم آج کے ترقی اور روشنی کے زمانے میں بھی خارجی محرکات کی اہمیت اور ضرورت تسلیم کرتی ہے، ہندو اپنی یادداشت کو تازہ رکھنے کے لیے اپنے بزرگوں کی تصویریں اپنے گھروں میں آویزاں رکھتے ہیں، عیسائی اپنی گردنوں میں صلیب ڈالے رکھتے ہیں، مسلمان مسجدیں بناتے ہیں اور ان کے میناروں سے دن میں پانچ مرتبہ چیخ چیخ کر لوگوں کو خدا کی وحدانیت اور محمدؐ کی نبوّت یاد دلایا کرتے ہیں، انگریز اور جاپانی ہر مقام پر بادشاہ کی تصویر کی نمائش کرتے رہتے ہیں۔ کالجوں اور اسکولوں میں بڑے بڑے شاعروں، ادیبوں، سائنس دانوں اور بادشاہوں کی تصویریں ہر درجہ میں ٹنگی رہتی ہیں اور اسے تعلیم کا ایک لازمی جزو سمجھا جاتا ہے، تاریخی عمارتوں کی تصویریں اور ان کے مکمل نقشے نصاب کی کتابوں میں موجود رہتے ہیں، یہ سب محض اس لیے ہوتا ہے کہ عوام کی توجہ ان خارجی محرکات کی مدد سے ان چیزوں پر مبذول ہو جاتی ہے جن پر اسے مبذول رکھنا ضروری ہوا کرتا ہے، یہ خارجی محرکات لاشعور کی گہرائیوں میں دبے ہوئے نقوش کو ابھار کے شعور کی سطح پر لے آتے ہیں اور اس طرح پرانی یادیں تازہ ہو جایا کرتی ہیں۔ ایسی حالت میں اگر حسینؑ کی یادگار قائم رکھی جانا ضروری ہے اور اگر ہمارے لیے یہ مفید ہے کہ ہم نسلِ انسانی کے سب سے بڑے حق پرست کے کارناموں کو یاد رکھیں تو تعزیہ اس مقصد میں

ہماری بہت امداد کرتا ہے اس لحاظ سے کاغذ اور بانس کی بنی ہوئی شبیہ کربلا کو زبردست اہمیت حاصل ہو جاتی ہے!

ماہرین تعلیم اور ماہرین نفسیات کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ شبیہہ، نقل، تصویر، یا ظاہری یادگاریں ہمارے ذہنوں میں گہرے اثرات مرتب کرتی ہیں، اور ان سے ہمارے کردار کی تشکیل میں زبردست امداد ملتی ہے، ان سے تصوّر میں مرکزیت پیدا ہوتی ہے جو اسے عقیدے کی شکل دے کر روح پر اثر انداز کر دیتی ہے اور مرئی اشیاء غیر مرئی تصورات کے مقابلہ میں انسان پر کہیں زیادہ اثر انداز ہوتی ہیں یہی وجہ ہے کہ اب فلموں کے ذریعہ تعلیم دی جانے لگی ہے اور تجربہ شاہد ہے کہ یہ "آنکھوں دیکھی تعلیم" اس "کانوں سنی تعلیم" سے کہیں زیادہ موثر اور مفید ہوتی ہے جو کتابوں کے ذریعہ دی جایا کرتی ہے۔ تعزیہ کا بھی یہی فلسفہ ہے، تعزیہ ہماری نگاہوں کے ذریعہ ہمارے دل و دماغ کو متاثر کرتا ہے، واقعۂ کربلا پر ہماری توجہات مرکوز کر دیتا ہے اور ہماری عقیدت کا مرکز بن کر ہمیں حسینؑ سے قریب تر کر دیتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ عام انسان کو کسی مجرد اصول یا کسی غیر مرئی فلسفہ سے وہ عقیدت پیدا نہیں ہو سکتی جو عشق بن کر روح پر اثر انداز ہو جائے انھیں اپنی محبت کو مرکوز کرنے کے لیے کسی ظاہری شے کا وسیلہ اختیار کرنا پڑتا ہے، مذاہب سے بھی جو محبت ہوتی ہے وہ بانیانِ مذاہب کی ذاتِ مقدسہ کے توسط سے پیدا ہوا کرتی ہے اس لیے کہ بانیانِ مذاہب بہر حال انسان تھے، ان سے محبت کی جا سکتی ہے اور پھر ان کے وسیلہ سے اُن اصولوں سے محبت کی جا سکتی ہے جو انھوں نے دنیا کے سامنے پیش کیے رام کی محبت ہندو دھرم کے لیے، گوتم کی محبت بُدھ دھرم کے لیے اور مسیحؑ کی محبت عیسائیت کے لیے جان و روح کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر ان شخصیتوں سے عقیدت ختم کر دی جائے تو شاید ان مذاہب کا بھی خاتمہ ہو جائے اس لیے کہ محض

مجرد اصولوں سے عوام کی وابستگی نہیں ہوا کرتی، حقانیت اور روحانیت سے محبت کے لیے یہ ضروری ہے کہ حق کے فداکاروں اور روحانیت کے علمبرداروں سے محبت کی جائے، ان کی محبت ان کے اصولوں سے جذباتی عقیدت پیدا کر دے گی اور یہ عقیدت انسانی روح پر اثر انداز ہوکر کردار کی تشکیل میں زبردست معاونت کرے گی۔ تعزیہ داری کی تہہ میں یہی نفسیاتی نکتہ کام کرتا ہے۔ تعزیئے ہماری محبتوں اور عقیدتوں کو سمیٹ کے کربلا سے وابستہ کر دیتے ہیں اور جب ہم شہید اعظمؑ کی محبت میں ڈوب جاتے ہیں تو ان اصولوں سے عقیدت پیدا ہو جانا بالکل قدرتی بات ہے جن کے لیے امام الشہداءؑ نے اپنی قیمتی جان قربان فرمائی تھی!

تعزیہ کربلا کی شبیہہ ہے، تعزیہ سے محبت پیدا ہوگی تو خود بخود کربلا سے محبت پیدا ہوگی، کربلا سے محبت ہوگی تو حسینؑ سے محبت پیدا ہوگی، حسینؑ سے محبت ہوگی تو حق سے، صداقت سے، انسانیت کی اعلیٰ قدروں سے، شرافت سے، شجاعت سے، ایمانداری سے، اصول پسندی سے اور سچی خدا پرستی سے محبت ہوگی اور جس دل میں یہ محبتیں جمع ہو جائیں گی وہ دل واقعی ایک سچے انسان کا دل ہوگا، ایک بلند تر انسان کا دل ہوگا، ایک کامل انسان کا دل ہوگا اور اس پاک دل نیز اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے بے مثل کردار کی تشکیل اس تعزیہ کے سبب سے ہوگی جسے ہم حسینؑ کی محبت میں اٹھایا کرتے ہیں!

آج کے زمانے میں انسانی نفسیات کے سلسلہ میں جو تحقیقات کی جا رہی ہیں، اس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کوئی چیز انسان پر تبھی اثر انداز ہوتی ہے جب اس کے لیے ایک خاص ماحول کی تشکیل کر دی جائے۔ اثر کے لیے ماحول کی ضرورت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ عبادت ہر جگہ کی جا سکتی ہے لیکن عبادت گاہیں اس لیے بنائی جاتی ہیں کہ اس میں عبادت کا ماحول پایا جاتا

ہے اور جگہ کا تقدس انسان پر ایک مخصوص نفسیاتی اثر ڈال کے اس کی حضوری قلب میں اضافہ کر دیتا ہے۔ تعلیم ہر مقام پر حاصل کی جا سکتی ہے، لیکن اسکول کا ماحول حصول تعلیم میں بے حد موثر ثابت ہوتا ہے، کام گھر میں بھی ہو سکتا ہے لیکن دفتر اس لیے قائم ہوتے ہیں کہ دفتر کا ماحول کام میں زیادہ معاون ہوا کرتا ہے، غرض یہ کہ ماحول کی اثر انگیزی ناقابل انکار ہے۔ یادگاروں کے سلسلہ میں تو ماحول کی ضرورت اور بھی زیادہ ہو جایا کرتی ہے۔ اس لیے کہ تاریخی واقعات کا تاثر صرف اسی صورت میں گہرا ہو سکتا ہے جب انسان کے لیے مناسب ماحول پیدا کر دیا جائے۔ اگر ماحول کی تشکیل نہ ہو تو تاریخی واقعات محض افسانے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور روح پر ہرگز اثر انداز نہیں ہو سکتے، یہی وجہ ہے کہ جب دنیا کی قومیں کسی پرانے تاریخی واقعہ کی یاد مناتی ہیں تو ماحول کی تشکیل پر پوری توجہ دیتی ہیں۔ ہندو لنکا کی فتح کی یاد مناتے ہیں تو رام لیلا کا ناٹک کیا جاتا ہے، سکھ گورو نانک کا یوم مناتے ہیں تو خالصہ دربار منعقد ہوتا ہے مسلمان رسول اللہؐ کی یاد مناتے ہیں تو میلاد کی محفلیں سجائی جاتی ہیں، یورپی قومیں ایسے مواقع پر تصاویر، مجسموں اور فلموں سے کام لیتی ہیں۔ غرض یہ کہ ایک فضا تیار کی جاتی ہے، ایک ماحول بنایا جاتا ہے اور اس کے بعد ہی یہ امید کی جاتی ہے کہ تاریخی واقعات قوم پر اثر انداز ہوں گے، بالکل یہی صورت حسینؑ کی یادگار کے سلسلہ میں برتی جاتی ہے، آدمی امامباڑہ میں جاتا ہے تو اس پر ایک مخصوص کیفیت طاری ہوتی ہے۔ عَلَم، تعزیہ اور تابوت وغیرہ اس کے لیے ایک سنجیدہ اور مقدس ماحول پیدا کر دیتے ہیں، ایسا ماحول جس میں وہ اپنی زندگی کی الجھنوں، گندگیوں اور برائیوں سے دور ہو کر اپنی ساری توجہ صرف حسینؑ پر مرکوز کر دیتا ہے، اسے امامباڑہ میں رکھے ہوئے تعزیئے اور تابوت دیکھ کر لاشعوری طریقہ پر یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ حسینؑ کے دربار میں موجود ہے۔ اور اس احساس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے دل کو دنیاداری کے تصوّرات

سے پاک کر کے حضور قلب کے ساتھ حسینؑ کی یاد پر متوجہ ہو جاتا ہے، سینہ زنی کی آوازیں، ماتم کا جوش اور اشک و آہ کا طوفان اس پر ایک خاص سنجیدگی طاری کر دیتا ہے، اب ایسی حالت میں جب کہ وہ ایک پاکیزہ قلب، پاکیزہ ذہن اور پاکیزہ روح کے ساتھ حسینؑ کے واقعات سنتا ہے تو لازماً ان سے وہ حد درجہ متاثر ہوتا ہے ——— قاعدہ ہے کہ اگر روح گندی ہو، اگر دل میں کدورتیں ہوں، اگر ذہن ناپاک ہو، اگر دماغ دنیا اور اس کی برائیوں کے تصورات سے بھرپور ہو تو نیکی کی کوئی تعلیم اثر انداز نہیں ہو سکتی، وعظ و پند صرف کان کے پردوں سے ٹکرائیں گے اور فضا میں تحلیل ہو جائیں گے، وہ نہ ذہن پر اثر ڈال سکتے ہیں اور نہ قلب کی گہرائیوں میں اتر کر سیرت کی تشکیل کر سکتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ شراب خانے کے بجائے مسجد میں عبادت کرنے کا حکم دیا جاتا ہے، حکم دینے والے اس نفسیاتی رمز سے واقف تھے کہ مسجد میں جانے کے بعد انسان پر ماحول کے تقدس کا جو گہرا لاشعوری اثر ہوا کرتا ہے اس کے نتیجہ میں وہ اپنے دل و دماغ کو پاکیزہ بنانے پر مجبور ہوا کرتا ہے اور اس پاکیزہ ماحول میں وہ جو تعلیم حاصل کرتا ہے وہی اس کی روح پر اثر انداز ہوتی ہے۔ بالکل یہی صورت حسینی تعلیم کی بھی ہے، حسینی تعلیم کو موثر بنانے کے لیے بھی ایک ماحول پیدا کیا جاتا ہے، امام باڑہ، تعزیہ، علم، تابوت، سبز سیاہ لباس ماتم، گریہ و مجلس دراصل اس ماحول کی تشکیل کا نام ہے، ان کی مدد سے وہ پاکیزہ، سنجیدہ اور مقدس ماحول تیار ہو جاتا ہے جن میں انسان اپنے دل کو برائیوں سے پاک کر کے، اپنے ذہن سے گناہوں کو دھو کے، اور اپنی روح میں اثر پذیری کی کیفیات پیدا کر کے ذکر حسینؑ سنتا ہے، اب یہ ذکر اس کے قلب و ذہن پر جس طرح اثر انداز ہو سکتا ہے، اس کا اندازہ کرنا ہمارے لیے بالکل آسان ہے۔ میں خود امامباڑوں میں گیا ہوں اور وہاں مجالس میں شرکت کر کے میں نے خود سنجیدگی اور تقدس کی اس فضا کو محسوس کیا ہے جو امامباڑوں میں موجود ہوتی ہے۔ امام باڑہ میں تعزیہ،

علم اور تابوت کی موجودگی نے مجھ میں ہمیشہ یہ احساس پیدا کیا ہے کہ میں مولا حسینؑ کے دربار میں حاضر ہوں اور اس احساس کے نتیجہ میں مجھ پر تقدس، طہارت اور پاکیزگی کی جو فضا طاری ہوئی ہے اس کے اثرات کا ضبط تحریر میں لانا محال ہے میں نے ماتم میں شرکت کی ہے اور اس کے نتیجہ میں میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ مجھ میں بھی وہی جوش اور وہی ولولہ پیدا ہو رہا ہے جو حسینی محبت کا ایک خاصہ ہے۔ میں ان کیفیات کو، عقیدت کے ان جذبات کو اور محبت کی آن و نمود کو جو امامباڑہ میں میرے دل میں پیدا ہوئی الفاظ کا روپ نہیں دے سکتا۔ یہ چیزیں صرف محسوس کی جا سکتی ہیں، بیان نہیں کی جا سکتیں، جو لوگ تعزیہ، عَلَم، تابوت اور ماتم وغیرہ پر اعتراض کرتے ہیں ان سے میں یہی عرض کروں گا کہ دور سے اعتراض نہ کیجیے، ایک ذرا سی زحمت کیجیے، امامباڑہ میں جا کے مجلس میں شرکت کیجیے اور پھر کسی ایسے جلسے میں جائیے جہاں بغیر کسی ماحول کی تشکیل کے کسی بزرگ کے تاریخی واقعات بیان کیے جا رہے ہوں ——— آپ کو فوراً دونوں کا فرق محسوس ہو جائے گا، آپ خود یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوں گے کہ امامباڑہ میں لوگ زیادہ سنجیدہ تھے، ان میں اثر پذیری کی صلاحیتیں بہت زیادہ تھیں، ان میں اس شخصیت کے لیے جس کا ذکر سُن رہے تھے زیادہ جوش اور زیادہ محبت کارفرما تھی اور عقیدت کا ایک طوفان تھا جو مجلس کے دوران میں فضا میں امنڈ رہا تھا لیکن دوسرے جلسہ میں آپ نے شرکت کی وہاں صرف ایک تاریخی کہانی سنی اور سنائی جا رہی تھی، بے کیف، بے رنگ اور بے اثر سی کہانی جو نہ سنانے والے پر اثر انداز ہو رہی تھی اور نہ سننے والے کو متاثر کر رہی تھی جو نری رسم پرستی تھی، جامد اور بے روح، جس میں نہ وہ ولولہ تھا اور نہ وہ تڑپ، نہ وہ گداز تھا اور نہ وہ ہیجان، نہ وہ زندگی تھی اور نہ وہ سوز جو انسان کی فطرت کو بدل دیتا ہے، جو اس کے کردار کو بدل سکتا ہے، جو اس کی سیرت کو ایک نئے سانچے میں ڈھال سکتا ہے اور جو انسان کو ایک بالکل اچھوتے قالب میں ڈھال کے اسے

انسانیت کی اعلیٰ ترین قدروں سے ہمکنار کر سکتا ہے! ——— امام باڑہ میں یہ کیفیت اپنے پورے شباب کے ساتھ موجود ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ حسینؑ کی یادگار منانے کے سلسلے میں امامباڑوں، تعزیوں اور علموں وغیرہ کی افادیت نفسیاتی اعتبار سے ناقابلِ انکار ہو جاتی ہے۔ امام باڑہ حسینی دربار ہے جہاں انسان حسینؑ کی موجودگی محسوس کرتا ہے! ——— ابن حسینؑ کی موجودگی جو فوق البشر تھا، جو انسانیت کا معمارِ اعظم تھا، جو حق کا پیکر اور صداقت کا مجسمہ تھا، جو روحانیت کا مظہرِ اتم اور عشقِ الٰہی کی جیتی جاگتی تصویر تھا، جو ایمان کا نقیب اور مظلومیت کا داعی تھا اور جس میں وہ عظیم روحانی قوتیں موجود تھیں جن کے مقابلہ میں شیطنت اور باطل کا وجود اپنی ساری حشر سامانیوں کے باوجود صفر معلوم ہوتا ہے! ——— اس حسینؑ کے دربار میں حضوری کا احساس گناہگار سے گناہگار انسان میں بھی پاکیزگی اور روحانیت کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نفسیاتی اصولوں کے جاننے اور سمجھنے والے امامباڑہ کی اہمیت اور افادیت تسلیم کرنے پر مجبور ہیں اور حسینی تعلیم کی اشاعت کے لیے امامباڑوں کا وجود حد درجہ ضروری تصوّر کیا جاتا ہے! ——— تعزیہ کربلا کی شبیہہ ہے، اس کربلا کی شبیہہ جو حق پرستوں کا قبلہ، دینداروں کا کاشی اور انسانیت کے پرستاروں کا کعبہ ہے جس کی گرم ریتی میں معصوم علی اصغرؑ کا خون جذب ہوا ہے جہاں ایمان اور حق پرستی کی سب سے بڑی جنگ لڑی گئی ہے اور جہاں نسلِ انسانی کا سب سے بڑا حق پرست ہیرو ابدی نیند سو رہا ہے! ——— اس کربلا کے سامنے حاضر ہونے کے بعد انسان میں تمرد، سرکشی، دنیاداری اور گناہ کے جذبات خود بخود مضمحل ہو جاتے ہیں، وہ ایک فردِ تنی، انکساری، تضرع اور گدازِ قلب محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، اسے حسینؑ یاد آتے ہیں جن کے مقابلہ میں وہ خود کو بہت حقیر سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ حسینؑ کی عظمت کا احساس اسے اس پر مجبور کر دیتا ہے کہ وہ نیک اور پاکیزہ بن کے اس محفل میں شریک ہو اور کم از کم جتنی دیر تک کربلا کی وہ شبیہہ جسے تعزیہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اس کے

سامنے موجود رہے وہ اسی نیکو کاری اور حق پرستی کے جذبات اپنے سینہ میں موجزن رکھے جن کی اعلیٰ ترین نمود کربلا کے بن میں کی گئی تھی۔ یہ حالت جب متواتر انسان میں پیدا ہوتی رہتی ہے تو لازماً اس کا اثر اس کے کردار پر پڑتا ہے، حسینؑ کی حضوری کا احساس اس کی سیرت کو ایک خاص سانچہ میں ڈھالنے لگتا ہے، اور اس سے حسینؑ کی یاد کا وہ مقصد پورا ہونا شروع ہوتا ہے جو انسان کو ایک اعلیٰ تر اور ایک برتر انسان میں تبدیل کر دیتا ہے!

عَلَم اس جھنڈے کی یادگار ہے جو حق پرستوں کے میر قافلہ حضرت عباسؑ کے ہاتھوں میں سونپا گیا تھا! ——— وہ عَلَم جو حق کا نشان تھا، انسانیت کا نشان تھا، شرافت اور خدا پرستی کا نشان تھا، ایمان اور معرفت کا نشان تھا اور جو ہمیں آج بھی ——— یہ فرض یاد دلاتا ہے کہ حق کا پرچم ہمیشہ بلند رکھنا چاہیے اگر دونوں بازو بھی کٹ جائیں، تب بھی دانتوں سے دبا کے اور سینہ سے چمٹا کے بلند رکھنا چاہیے اور اس وقت تک اسے سرنگوں نہیں ہونے دینا چاہیے جب تک کہ جسم سے خون کا آخری قطرہ بھی نہ بہہ جائے ——— یہ عَلَم ایک حق پسند دنیا کے سامنے عباسؑ کی لافانی مثال پیش کر کے اسے حق کا پرچم بلند رکھنے کی دعوت دیتا ہے اور اس طرح انسانیت کے اعلیٰ تر جذبات کو پوری شدت سے ابھارتا ہے جن کے ابھارے جانے اور دلیرانہ طریقہ پر اُبھارے جانے پر ہی نسلِ انسانی کی حقیقی ذہنی، مادّی اور روحانی ترقی کا انحصار ہے!

تابوت، حسینؑ سے سچی محبت کرنے والوں کی سچی محبت اور عقیدت کا نشان ہے ——— تابوت اس جذبہ کے اظہار کے لیے اٹھایا جاتا ہے کہ اگر ہم کربلا میں موجود ہوتے تو حسینؑ کی نعش کو ہرگز تین دن تک بے دفن و کفن نہ پڑا رہنے دیتے اور دنیا کے سب سے بڑے حق پرست مجاہد کی میت پورے اہتمام کے ساتھ اٹھائی جاتی! ——— لیکن اس کے ساتھ ہی تابوت میں ایک گہری معنویت بھی ہے تابوت مظلومیت کی طاقت کا مظہر ہے، تابوت ہمیں سبق دیتا ہے کہ حق کی حمایت

جارحانہ انداز اختیار کر کے نہیں ہوا کرتی بلکہ حق کی جنگ مظلومیت، قربانی اور محبت کے حربوں ہی سے ہی جیتی جاتی ہے، تابوت مظلومیت اور عدم تشدد کی نشانی ہے، باطل پر حق کی خاموش فتح کی نشانی ہے، ہمدردی، رحم، انسانیت اور صبر و رضا کی نشانی ہے اور اس لحاظ سے ہماری سیرت کی تشکیل میں اس کی افادیت ناقابلِ انکار ہے!

علی اصغرؑ کا جھولا فداکاری کی معراج کا مظہر ہے، یہ ننھّا مُنّا جھولا ہمیں حق کے اس سب سے تابناک، سب سے چمکدار اور سب سے قیمتی، ننھے سے موتی کی یاد دلاتا ہے جس نے واقعہ کربلا کو پورے آب و رنگ سے سنوار کے اس میں معصومیت اور پاکیزگی کی روح دوڑا دی ہے۔ جھولا اٹھانے والے تاریخِ حق پرستی کے سب سے کمسن، لیکن سب سے زیادہ اثر آفرین، مجاہد کی یاد تازہ کر کے نسلِ انسانی کو یہ درس دیتے ہیں کہ حق کی خاطر چھ ماہ کے بچے کو بھی تیروں کے سامنے پیش کر دینے سے گریز نہیں کرنا چاہیے اور اگر مذہب، انسانیت اور صداقت کی راہ میں اتنی عظیم قربانی بھی طلب کی جائے جتنی کہ علی اصغرؑ کی شہادت تھی تو اسے بھی مردانہ وار پیش کر کے انسانیت کے مردہ جسم میں زندگی اور تازگی پیدا کر دینے پر ہمیشہ تیار رہنا چاہیے!

دنیا میں ہزاروں مردوں اور عورتوں نے عزت کمائی ہے، نام حاصل کیا ہے، شہرت پائی ہے، ان میں سے اکثر کی یادگاریں بھی قائم کی گئی ہیں، ان کو عقیدت و محبت سے یاد بھی کیا جاتا ہے لیکن تاریخِ عالم میں چھ مہینہ کا صرف ایک ہی بچہ ہے جس نے یہ عزت و عظمت حاصل کی ہے کہ دنیا اسے آنسوؤں کی جھڑیوں سے یاد رکھتی ہے۔ اور اشکوں کے ساز پر اس کی مدح کے ترانے بلند کرتی ہے، یہ بچہ نہ بول سکتا تھا، نہ چل سکتا تھا، نہ کوئی کام کر سکتا تھا، لیکن چونکہ اس نے دنیا کے سب سے بڑے مجاہدِ حق کو اپنے لہو کی رنگینی، اپنے لبوں کی معصومیت اور اپنے سینہ کی تب و تاب عطا کر دی، چونکہ اس ننھے سے بچے نے حق کی قوتوں کو

اپنے خون کی دھاروں سے بقائے دوام عنایت کر دی، چونکہ اس کی قربانی حسینؑ کی بے لوثی اور بے گناہی کی گواہ بن گئی، چونکہ اس کی موت نے انسانیت کی لاش میں زندگی اور حرارت کی روح پھونک دی، چونکہ اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں اور ڈھلے ہوئے منکے نے حق کی نگاہوں میں شرارے اور انسانیت کے جامد چہرے پر شگفتگی پیدا کر دی، چونکہ اس کی بے بسی نے دنیا کے ہزاروں انسانوں میں حق پر مر مٹنے کی قوت ابھار دی، چونکہ اس کی کمھلائی ہوئی صورت حق کی فتح دائمی کی نشانی بن گئی اور چونکہ اس کی بے گناہ موت نے جہاد حق کو ایک لازوال نور، ایک ابدی رنگ، ایک سرمدی نغمہ، ایک انمٹ تابندگی ایک قیامت خیز اثر آفرینی، اور ایک حیرت انگیز تاثر عطا کر دیا اس لیے نسل انسانی اس بچہ کو عزیز رکھتی ہے، اس کی یادگار مناتی ہے اور جھولا نکال کے یہ اعلان کرتی ہے کہ عزت، شہرت، عظمت اور ابدیت صرف جوانوں اور بوڑھوں کی املاک خصوصی نہیں، چھ ماہ کا بچہ بھی حق کے کام آجائے تو ابدی عزت و عظمت اس کے قدم چومنے پر مجبور ہو جائے گی!

جو شخص جھولے کی مخالفت کرتا ہے وہ دراصل انسانی عظمت کا منکر ہے، وہ اس عظمت انسانی سے انکار کرتا ہے کہ چھ ماہ کے بچہ میں بھی وہ صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں، جو اگر ظاہر ہو جائیں تو ساری کائنات اس کے سامنے سربسجود نظر آئے، ایک متشکک اعتراض کر سکتا تھا کہ آدمؑ سے جنّت میں ایسی کونسی صلاحیت ظاہر ہوئی تھی کہ وہ مسجود ملک قرار دیے جانے لگے تھے علی اصغرؑ کا واقعہ اس کا ایک خاموش جواب ہے، چھ ماہ کے علی اصغرؑ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ایک ننھے سے بچہ میں قدرت عظیم ترین صلاحیتیں پوشیدہ رکھتی ہے اور ایک کمزور شش ماہہ ایک پوری قوم کی تاریخ کو تابناک بنا سکتا ہے، اب اسی سے آدمؑ کی صلاحیتوں کو قیاس کیجیے اور یہ سمجھ لیجیے کہ آدمؑ کی صلاحیتوں کا اظہار نہیں ہوا تھا تو نہ سہی، لیکن نفخ روح کے وقت ہی آدمؑ ان عظیم صلاحیتوں

کے مالک تھے جنھوں نے ان کو مسجود ملک بننے کے قابل کر دیا تھا، علی اصغر کے جھولے کی نمائش ہم میں انسان اور اس کی عظیم صلاحیتوں پر اعتماد پیدا کرتی ہے، ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ایک چھ مہینہ کا بچہ بھی آفتاب سے زیادہ درخشندگی اور آسمانوں سے زیادہ عظمت کا مالک ہوتا ہے، صرف ایک طاقت ور جوان ہی اشرف المخلوقات کے لقب کا مالک نہیں ہوتا، انسان کا بچہ بچہ اس عظمت کا مالک ہوتا ہے کہ کائنات اس کے شرف و منزلت کے مقابلہ میں ہیچ ہوا کرتی ہے، ایسی حالت میں علی اصغرؑ کا جھولا عظمت انسانی کا نشان ہے، انسان کے مسجود ملائکہ قرار دیے جانے کا ثبوت ہے، کائنات کی دوسری چیزوں پر انسان کی فضیلت کا اعلان ہے، اور ہم یہ جھولا نکال کے ہر سال انسان کو اس کے اس حقیقی عز و شرف کی یاد تازہ کرایا کرتے ہیں، جسے وہ اغوائے شیطانی کے نتیجہ میں بھول چکا ہے ہم یاد دلاتے ہیں کہ جوانی اور قوت کے زمانہ میں ہی نہیں، آغوش مادر کی کمزوریوں میں بھی وہ علی اصغرؑ کی سی عظمت کا مالک ہوا کرتا ہے اور اگر وہ حق کا ساتھ دیتا رہے تو کائنات ہمیشہ اس کے سامنے سر جھکائے رہنے پر مجبور ہے، یہ ایک عظیم درس ہے انسانی عظمت و رفعت کا، ایک پیغام ہے نسل انسانی کی سربلندی اور ترفع کا ——— اور جھولا اسی درس کی ایک خاموش نشانی ہے!

ذوالجناح حسینؑ کے گھوڑے کی شبیہہ ہے ——— اس گھوڑے کی شبیہہ جس نے جانور ہونے کے باوجود حق پرستوں کا ساتھ دیا اور ان باطل پرست انسانوں کے لیے ایک مثال چھوڑ گیا جو محض عارضی مفادات کی خاطر شیطان کے حضور میں اپنی پیشانیاں خم کر دینے پر تیار ہو جاتے ہیں، ذوالجناح کی شبیہہ اس لیے نکالی جاتی ہے کہ لوگ یہ سمجھیں کہ حق کا ساتھ دینے والا جانور بھی امر ہو جاتا ہے، اس کا نام بھی ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور لاکھوں انسان اس سے محبت کرنے پر مجبور ہوا کرتے ہیں ——— اور عین اس وقت جب کہ باطل کے پرستار

شمر و یزید انسان ہونے کے باوجود ذلت و خواری کا شکار ہوتے ہیں، ایک جانور کی محض اس لیے عزت ہوتی ہے کہ وہ معرکۂ حق و باطل میں حق پرستوں کی صف میں نظر آرہا تھا!—— یہ چیز بجائے خود انسان کے جذبات حق پرستی و فداکاری کو ابھارنے میں بے حد معاون ہوتی ہے کیونکہ جب بھی ہم ذوالجناح کی شبیہہ کا احترام ہوتے دیکھتے ہیں تو یہ زندہ اور عملی مثال ہمارے دلوں میں بھی یہ خواہش پیدا کر دیتی ہے کہ کاش ہم بھی حق کے فدائیوں میں ہوتے تو ہماری بھی ایسی ہی تکریم اور ایسی ہی عزت کی جاتی جیسی کہ اس بے زبان کی، کی جارہی ہے—— سیرت کی تشکیل کا اس سے زیادہ مؤثر حربہ اور کیا ممکن ہوسکتا ہے!

ماتم اور مجلس حسینی پیغام کے اشاعت کا ذریعہ ہیں، ان کے ذریعہ حسینؑ کا پیغام نشر ہوتا ہے، اور پوری سنجیدگی، جوش اور عقیدت کی فضا میں نشر ہوتا ہے—— اگر یہ حقیقت ہے کہ حسینؑ کا پیغام نسلِ انسانی کے لیے بیحد مفید ہے، اور اگر یہ بھی حقیقت ہے کہ حسینؑ کا نمونۂ عمل ہمارے سامنے موجود رہنا ہم میں انسانیت کی اعلیٰ ترین قدریں ابھار سکتا ہے تو حسینؑ کے پیغام و عمل کی اشاعت کا اس سے زیادہ اثر آفرین اور جذباتی طریقہ اور کوئی نہیں ہوسکتا جو سینہ زنی اور

حسینؑ حسینؑ حسینؑ حسینؑ

کی جگر خراش آوازوں کے ذریعہ پیدا کیا گیا ہے!

حسینؑ کی یاد منانے میں سب سے بڑا حصہ آنسوؤں کا حصہ ہے، اُن آنسوؤں کا جو نفسیات کے ہر قانون کو توڑ کے، عقلِ انسانی کو مجبور کر کے اور سائنس کے تمام اصولوں سے ٹکرا کے ہماری پلکوں پر لہراتے اور ہمارے دامن میں جذب ہوتے رہتے ہیں، ان اعجاز آفریں آنسوؤں کی اہمیت ناقابلِ انکار ہے، آنسو قلب میں گداز پیدا کرتا ہے، آنسو اس ٹوٹے ہوئے دل کی نشانی ہوتا ہے جو انسانیت کا سب سے بڑا سرمایہ ہوا کرتا ہے،

آنسو ہمدردی کا جوہر پیدا کرتا ہے، آنسو خدا کی رحمت کو نزدیک لاتا ہے اور آنسو انسان میں اثر پذیری اور انفعالیت کی وہ شدید کیفیت پیدا کر دیتا ہے جو کسی تعلیم کو قبول کرنے کے لیے حد درجہ ضروری ہوا کرتی ہے، حسینؑ کی یاد آنسوؤں کے ذریعہ منانے میں یہی مصلحت ہے کہ پگھلے ہوئے دل حسینؑ کی تعلیمات کو زیادہ آسانی سے قبول کر سکتے ہیں، وہ ان تعلیمات کا زیادہ سے زیادہ اثر لے سکتے ہیں اور آنسوؤں کے ذریعہ پیدا ہونے والی انفعالی کیفیت کے نتیجہ میں حسینی تعلیمات رونے والوں کی روح پر ایسے قیامت آفریں انداز میں نقش ہو جاتی ہیں کہ مرتے دم تک ان کے اثرات ختم نہیں ہو سکتے، یہ فن تعلیم کا سب سے اہم اور اثر آفریں نفسیاتی اصول ہے اور حسینؑ کے ماننے والے مستحق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اپنے رہنما کی تعلیمات کو زندہ رکھنے، خود ان تعلیمات کا اثر قبول کرنے اور ان تعلیمات کو اپنے رگ و پے میں جاری و ساری کر کے ان کے رنگ میں ڈوب جانے کے لیے وہ مؤثر ذریعہ اختیار کیا ہے جس کا نام آنسو ہے ——— وہ معجزہ نما آنسو جس کے اعجاز کا تذکرہ میں سابقہ باب میں کر چکا ہوں!

بغاوت

جہالت اور تعصب بری بلا ہیں اور جب یہ صفات پڑھے لکھے لوگوں میں پیدا ہو جاتی ہیں تو عجیب و غریب کرشمے دیکھنے میں آتے ہیں، مثال کے طور پر حسینی کارنامے کو دیکھ لیجیے۔ تیرہ سو برس سے دنیا کے سارے انصاف پسند اور حق پرست انسان، خواہ وہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتے ہوں، خواہ وہ کسی ملک کے باشندے ہوں، وہ خواہ نسل و رنگ کی بنیاد پر کوئی ہوں، حسینؑ سے عقیدت کا اظہار کر رہے ہیں، اور اسے نسل انسانی کا ایک عظیم شاہکار تسلیم کر رہے ہیں، لیکن اسی دنیا میں بعض ایسے لوگ بھی ہیں جن کے سروں پر فضیلت کی دستاریں اور دوش پر علم کی عبائیں نظر آتی ہیں لیکن جہل و تعصب نے ان کے دلوں کو اتنا تاریک، ان کے ذہنوں کو اتنا پست اور ان کے قوائے فکریہ کو اتنا مفلوج اور مضمحل کر دیا ہے کہ وہ آفتاب حسینی پر خاک ڈالنے کی ناکام کوشش کرتے رہتے ہیں اور آج کے عقل و بصیرت کے زمانہ میں بھی وہ خلاف عقل اور احمقانہ باتیں دہرانا "مظاہرہ علم و فضل" سمجھتے ہیں جو بنی امیہ نے جہاں عرب کو سمجھانے اور اپنے جرائم پر پردہ ڈالنے کے لیے ایجاد کی تھیں کبھی یہ ارشاد ہوتا ہے کہ "حسینؑ اپنے جد کی تلوار سے قتل ہوئے ——— گویا یزید مجرم نہیں ہے بلکہ خاکم بدہن، نقل کفر کفر نباشد، رسولؐ اللہ مجرم قتل ہیں اور کبھی یہ گہر افشانی ہوتی ہے کہ اللہ کی مرضی اور "تقدیر" یہی تھی کہ حسینؑ قتل ہوں اور یزید قتل کرے اس لیے مجرم قتل اللہ ہے نہ کہ یزید ———

یہ عقل کے دشمن نام نہاد "علمار" جو مردہ کتابوں کے کیڑے اور پارینہ و فرسودہ "دلائل" بلکہ اوہام باطلہ کا گورستان بنے رہنے پر فخر محسوس کرتے ہیں، یہ بھی نہیں سمجھتے کہ وہ یزید کی حمایت و پاسداری میں دین و ایمان سے بھی ہاتھ دھو لیتے ہیں اور خدا و رسولؐ کو معاذ اللہ مجرم قرار دینے کی جسارت کر کے یزید کے جرم پر تو پردہ ڈالنے سے قاصر رہتے ہیں، خود اپنے سر دین سے خارج ہو جانے کا جرم مول لے لیتے ہیں، لیکن بُرا ہو تعصب کا کہ وہ بایں دعوائے علم و فضل اتنی معمولی سی بات بھی نہیں سمجھتے اور ایسی کور باطنی کا مظاہرہ کرتے ہیں جس پر جہل قہقہہ زن ہوتا ہے اور جنون تبسم ریز!

حمایت یزید میں ایک دلیل یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ یزید بادشاہِ وقت تھا اور حسینؑ نے معاذ اللہ اس کے خلاف خروج کر کے "بغاوت" کا مظاہرہ کیا تھا اس لیے وہ کسی ہمدردی کے مستحق نہیں قرار دیے جا سکتے!

یہ دلیل شاہ پرستی کے اس دور میں جب بادشاہ کو کرشن کا اوتار یا ظل اللہ تسلیم کیا جاتا تھا شاید کوئی وزن رکھتی ہو لیکن آج کی ترقی اور روشنی کے دور میں یہ بات صرف انہیں لوگوں کی زبان سے ادا ہو سکتی ہے جو عقل و خرد سے بے گانہ یا کم از کم سیاسی و ملّی شعور سے قطعاً محروم ہوں۔ بادشاہ کو مامور من اللہ یا کرشن کا اوتار مان کے اس کی پرستش کرنے والوں کے دور میں بادشاہِ وقت کے خلاف لب کشائی کرنا واقعی ایک ناقابلِ عفو گناہ، ایک بھیانک جرم اور ایک کافرانہ حرکت خیال کیا جاتا تھا لیکن آج کے علم السیاسیات اور علم عمرانیات کی رو سے ایک ظالم، حق ناشناس، جابر اور

غلط کار حکمران کے خلاف بغاوت کا پرچم بلند کرنا نہ صرف یہ کہ ایک شہری کا حق تسلیم کیا جاتا ہے بلکہ اسے ایک ملّی اور قومی فریضہ قرار دیا جاتا ہے چنانچہ جو لوگ سلاطین جبر کے خلاف بغاوت کرتے ہیں ان کو نہ صرف یہ کہ بُرا نہیں کہا جاتا بلکہ ان کو

ملک کا نجات دہندہ اور ملک کا ہیرو

قرار دے کر عزت کے ایوان میں بقائے دوام کا تاج عطا کیا جاتا ہے!

روس میں زار کی بادشاہت تھی، لینن نے اس حکومت جبر کے خلاف بغاوت کی اور آج ساری دنیا کا محنت کش طبقہ لینن کو اپنا ہیرو اور نجات دہندہ تسلیم کرتا ہے!

ہندوستان پر انگریزوں کا راج تھا، گاندھی جی نے اس حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور ہندوستانی ان کو "باپو" کے معزز لقب سے یاد کرتے ہیں!

چین پر چیانگ کائی شیک کا پرچم حکومت لہرا رہا تھا، ماوزی تنگ نے اس کے خلاف بغاوت کی، اور دنیا اسے چین کا محسن اعظم قرار دیتی ہے!

ترکی پر سلاطین عثمانی کی حکومت تھی، مصطفٰے کمال نے اس عفو مفلوج کو کاٹ دیا، آج اسے کمال اتاترک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے!

ہند چینی پر فرانس کا انتداب تھا، ہوچی مینہ نے فرانس کے خلاف تلوار سنبھالی اور سارا ایشیا اسے ہند چینی کا قائد اعظم مانتا ہے!

مصر میں فاروق کا راج تھا، جمال عبدالناصر نے اس کے خلاف بغاوت کی اور آج وہ عربی دنیا کا سب سے محبوب قائد شمار کیا جاتا ہے!

تیونس پر فرانس کا قبضہ تھا، حبیب بورقیبہ نے اس کے خلاف عَلمِ بغاوت بلند کیا، دنیا حبیب کو تیونس کا ہیرو مانتی ہے!

یزید کے طرفدار ملّاؤں کی منطق کی رو سے لینن، گاندھی، اتاترک ماؤ، ہوچی مینہ، بورقیبہ اور جمال سب باغی ہیں، سب کشتنی وگردن زدنی ہیں، سب غلط کار گنہ گار ہیں اور ہندوستان پر انگریزوں کی، روس پر زار کی، ترکی پر عبدالحمید خامس کی، تیونس پر فرانس کی، اور چین پر چیانگ کی حکومت نہ صرف یہ کہ صحیح، جائز اور برحق ہے بلکہ ——— "اسے اسلام کی تائید وحمایت بھی حاصل ہے!"

یہ ہے اموی مکتب فکر کے پروردہ ملا کا فتویٰ، اس لیے کہ وہ بادشاہ وقت کے خلاف جنگ کو ناجائز تصوّر کرتا ہے اور ایک بادشاہ جابر کے خلاف تلوار اٹھانا اس کے نزدیک ایسی "بغاوت" ہے جس پر انسان کسی ہمدردی کا مستحق نہیں رہتا یہی وجہ ہے کہ وہ حسینؑ کو باغی قرار دیتا ہے اور ان کی ماتم داری کو حرام قرار دیتا ہے ——— لیکن اسے کیا کیا جائے کہ دنیا کا کوئی سلیم العقل انسان اس کے تصوّر کو ماننے پر تیار نہیں ہو سکتا۔ دنیا بادشاہ جابر کے خلاف جنگ کرنے والوں کو بطل حریت، مجاہد ملت، محسن قوم، اور انسانیت کا نجات دہندہ تصوّر کرتی ہے، ان کو عزت کے دربار میں رفعت و منزلت کی کرسیاں عطا کرتی ہے، ان کے قدموں تلے آنکھیں بچھانا فرض سمجھتی ہے، ان کی یادگاریں قائم کرنا اپنے جذبۂ احسان شناسی کا مظہر تصوّر کرتی ہے، ان کی ولادت کے دن

جشنِ قومی اور وفات کی تاریخ سوگ مناتی ہے اور اُموی مُلّا کی اس چیخ پکار کو لایعنی، مہمل، احمقانہ اور رجعت پسندانہ قرار دیتی ہے کہ ایک ظالم، جابر، عیاش، بدکار اور حق ناشناس سلطان بھی "اولی الامر" ہے اس لیے اس کی اطاعت واجب اور اس کے خلاف بغاوت حرام ہے!

چند لمحوں کے لیے امام حسین علیہ السّلام کی مذہبی اور روحانی حیثیت سے قطع نظر بھی کر لیجیے، تو خالص دنیاوی اعتبار سے بھی آپ دنیائے اسلام کے نجات دہندہ قرار دیے جائیں گے اس لیے کہ آپ نے مسلمانوں کو ایک ظالم، جابر، بے دین، باطل پرست اور حق ناشناس سلطان کے چنگل سے نجات دلانے کی جنگ فرمائی تھی اور اس اعتبار سے آپ دنیا کے ان تمام حریت پسندوں اور انقلابیوں کے سردار قرار پائیں گے جن کے نام آج ساری دنیا میں احترام کے ساتھ لیے جاتے ہیں!

اموی مکتب فکر کے پروردہ ملّاؤں کے نظریہ کو مان لیا جائے تو اسلام کو ایک ایسی رجعت پسند، شاہ پرست اور عوام دشمن تحریک قرار دینا پڑے گا جو سلاطین جبر کی حمایت اور طرفداری کے لیے شروع کی گئی ہو، جس کے نقطۂ نظر سے روس کا زار، چین کا چیانگ اور ترکی کا عبدالحمید اسلام کا نمائندہ قرار پائے گا اور لینن، ماؤ اور اتاترک بدترین مجرم قرار دیئے جانے کے لائق ہوں گے اس لیے کہ ان لوگوں نے حکمرانِ وقت کے خلاف تلوار اٹھائی تھی —— اور وہ اسلام جو دنیا سے یہ احمقانہ بات تسلیم کرانا چاہے گا اس کی دنیا میں جو وقعت ہو سکتی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے، غیر مسلم تو الگ رہے، شاید ترکی، مصر، انڈونیشیا

ایران اور پاکستان کے مسلمان بھی اس اسلام سے استعفٰے دینے پر تیار ہو جائیں گے جو جمال عبدالناصر کے مقابلہ میں فاروق کو، اتاترک کے مقابلہ میں عثمانیوں کو، عبدالرحیم سوکارنو کے مقابلہ میں ولندیزیوں کو، رضاشاہ کے مقابلہ میں قاچاریوں کو اور قائد اعظم محمد علی جناح کے مقابلہ میں انگریزوں کو اولی الامر اور مطاع تصور کرتا ہو اور ان حریت پرور قائدین کو مجرم، غلط کار اور گردن زدنی قرار دیتا ہو۔

یزید کے جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے اسلام کے رخ روشن پر تیزاب چھڑک دینا اور دنیا کے سب سے ترقی یافتہ دین کو ایک رجعت پسند اور مردار شاہ پرست تحریک قرار دینا صرف انھیں "علماء" کا کام ہو سکتا ہے۔ جن کو تعصب نے اندھا اور بے جا پاسداری نے کور باطن بنا دیا ہو!

اگر حسینؑ کے اسلامی و شرعی جہاد کو بغاوت سے بھی تعبیر کیا جائے تو یہ "بغاوت" نسل انسانی کا ایک عظیم اصولی محاربہ قرار پائے گی اس لیے کہ ——— (۱) یہ بغاوت تھی نسلی بادشاہت کے اس مردود و ملعون اصول کے خلاف جس کا دنیائے اسلام میں پہلا نمائندہ یزید تھا! (۲) یہ بغاوت تھی اس دور غلامی کے خلاف جو یزید دنیائے اسلام پر نافذ کرنا چاہتا تھا۔ اس حقیقت سے انکار محال ہے کہ یزید اپنی رعایا کو اپنا غلام تصوّر کرتا تھا چنانچہ مکّہ اور مدینہ کی تاخت کے بعد یزید نے وہاں کے باشندوں سے اپنی "غلامی" پر بیعت لی تھی۔ جو بادشاہ جابر تمام انسانوں سے اپنی غلامی پر بیعت لے اس کے خلاف بغاوت نسلِ انسانی پر سب سے بڑا احسان ہے۔ آج دنیا مغربی پروپاگنڈہ کے زیر اثر ابراہام لنکن کو انسانیت کا عظیم محسن مانتی ہے اس لیے کہ اس نے جنوبی امریکہ کے سیاہ فام غلاموں کو آزادی دلانے اور غلامی کی رسم مٹانے کے لیے اپنی جان دیدی تھی، حسینؑ نے بھی آج

سے تیرہ سو سال قبل پوری دنیائے اسلام سے غلامی پر بیعت لیے جانے کے خلاف جنگ کی تھی اور اس اعتبار سے وہ انسانیت کے محسنِ اعظم قرار دیے جانے کے مستحق ہیں۔

(۳) یہ بغاوت تھی جاگیرداری کی اس منحوس رسم کے خلاف جس کی داغ بیل یزید ڈال رہا تھا چنانچہ عمر سعد کو رے کی جاگیر دینے کا وعدہ اس امر کا ثبوت ہے کہ یزیدی دور میں جاگیرداری کا آغاز ہو چکا تھا، حسینؑ نے اس غیر منصفانہ نظام کے خلاف جنگ کر کے انسانیت کی ایک عظیم خدمت انجام دی اور اس اعتبار سے وہ انقلابی قائدین کی صفِ اوّل میں ایک ممتاز مقام کے مالک نظر آتے ہیں۔

(۴) یہ بغاوت تھی اس اکتناز اور قومی سرمائے پر ایک مخصوص خاندان کی ملکیت کے خلاف جو انسانوں میں دولت کی بنیاد پر مختلف طبقات پیدا کر کے انسانوں کو بھوک، افلاس، تنگ دستی، جہالت اور تباہی کا شکار بنا دیتی ہے اور جس کا دنیائے اسلام میں استحکام یزید کے ہاتھوں ہو رہا تھا!

(۵) یہ بغاوت تھی اس مذہبی اور فکری جبر کے خلاف جس کی نمائندگی یزید کر رہا تھا اس لیے کہ وہ مسلمانوں کو اپنی بیعت پر بزورِ شمشیر مجبور کر رہا تھا اور عوام کے اس جائز حق کو تسلیم نہیں کرتا تھا کہ وہ اپنے افکار و عقائد کے باب میں آزاد ہیں، وہ مذہبی اور فکری غلامی نافذ کرنا چاہتا تھا جس کے خلاف جنگ کرنا ہر اس انسان کا فرض ہے جو فکری اور مذہبی آزادی کی قدر و قیمت کو جانتا ہے!

(۶) یہ بغاوت تھی نسل پرستی اور قبیلہ پرستی کے ان جاہلی تصورات کے خلاف جو بنی امیہ دنیائے اسلام میں عام کر رہے تھے اور جنھیں مٹا دینا نہ صرف اسلام کی بلکہ انسانیت کی ایک عظیم خدمت کہا جا سکتا ہے۔

حسینؑ نے نعرہ جہاد بلند کیا نسلی بادشاہت اور انسانی حاکمیت کے غلط اصول کے خلاف، جاگیرداری کے خلاف، سرمایہ داری کے خلاف، نسل پرستی اور قبیلہ پرستی کے خلاف، فکری اور مذہبی آزادی سلب کیے جانے کے خلاف اور انسانوں سے غلامی کے نام پر بیعت لیے جانے کے خلاف۔ اگر اموی ملاؤں کے نزدیک یہی "بغاوت" ہے تو ہزار آفرین ہے اس "بغاوت" پر جس نے انسانیت کو آزادی کا درس دیا، جس نے معاشی انصاف کی راہیں ہموار کیں، جس نے حریتِ فکر کے دروازے کھولے اور جس نے انسانی مساوات کے پرچم بلند کیے، ہمیں یقین ہے کہ دنیا کا ہر سمجھ دار انسان اس "بغاوت" کی تائید کرے گا، اس "باغی" کو نسل انسانی کا محسن اعظم تسلیم کرے گا اور ہوا خواہان بنی امیہ کی جانب سے اس "بغاوت" پر جو فریاد و فغاں ہوتی رہتی ہے اسے انسانیت اور آزادی کے دشمنوں کی ایک نفرت انگیز چیخ یا ایک مضحکہ خیز پکار سے زیادہ کوئی وقعت دینے پر تیار نہیں ہو گا!

جہاد

معرکۂ کربلا کے متعلق عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ ایک ظالم ، جابر اور عیاش حکمران کے خلاف جنگ تھی ، لیکن یہ معاملہ کا محض ایک ہی رُخ ہے !

اس تصویر کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ جنگ ایک "امام" نے کی تھی اور امام کی جنگ "جہاد" ہوا کرتی ہے !

شریعت اسلامی کی رو سے جہاد صرف کفار و مشرکین کے مقابلہ میں ہوا کرتا ہے۔ فاسق و فاجر مسلمانوں کے خلاف نہیں ہوا کرتا !

ایسی حالت میں یہ ماننا پڑے گا کہ حسینؑ نے یزید کے خلاف اس لیے جنگ نہیں کی تھی کہ وہ شرابی ، زانی اور ظالم تھا بلکہ اس لیے کی تھی کہ یزید ان کی نگاہ میں کافر تھا اور ایک کافر کا مسلمانوں سے مطالبہ بیعت یقیناً ایک ایسا امر تھا جس پر جہاد واجب تھا !

یہاں سے یزید کے ایمان کی بحث کا آغاز ہوتا ہے !

اسلام کے تین عظیم اصول ہیں ، جن پر ایمان رکھنا ہر مسلمان کے لیے واجب ہے ، ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی انسان کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ یہ عظیم اصول ، توحید ، نبوّت اور قیامت ہیں — جن کو اصول دین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے !

اب ان اصول دین کے متعلق یزید کا نقطۂ نظر ملاحظہ ہو !

دمشق کا دربار ہے، یزید تختِ حکومت پر جلوہ گر ہے، پائیں تخت حسینؑ کا سر طشت طلا میں رکھا ہے، آلِ رسولؐ سامنے قیدیوں کی حیثیت سے ایستادہ ہے کہ اچانک حکمران وقت کی آواز بلند ہوتی ہے:

"نہ کوئی وحی آئی، نہ پیغام آیا، یہ سب ایک ڈھونگ تھا
جو بنی ہاشم نے حصول اقتدار کے لیے کھڑا کیا تھا!"

یزید وحی سے انکار کر رہا ہے، قرآن سے انکار کر رہا ہے، نبوت سے انکار کر رہا ہے، محمد رسولؐ اللہ کی رسالت سے انکار کر رہا ہے اور اس طرح اسلام کے ایک عظیم اصول، ایک بنیادی عقیدہ کا مذاق اڑا رہا ہے، کیا اس کے بعد بھی اسے مسلمان کہا جا سکتا ہے؟

شراب کی بزم آراستہ ہے، دمشق کا رنگیلا شہزادہ جام بکف ہے، مینائے عشرت سے صہبائے سرخ لنڈھائی جا رہی ہے، سرور کے عالم میں یزید کی زبان پر کچھ اشعار جاری ہوتے ہیں جو اس کے عقائد کی غمازی کر رہے ہیں، کہتا ہے:

"پی اے حسین مجوبہ پی! اگر اسلام شراب کی اجازت نہیں دیتا تو دین مسیحی پر پی! اس لیے کہ ثواب و عتاب، جنت و نار ڈھکوسلے کے علاوہ اور کچھ نہیں، اس زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں!"

یہ ہے قیامت کے بنیادی عقیدۂ اسلامی کے متعلق یزید کا نظریہ! دمشق کا سلطان نہ جنت و نار کا قائل ہے، نہ جزا و سزا کا، نہ ثواب و عتاب کا، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ حیات بعد الممات کے تصور ہی کا سرے سے قائل نہیں ہے اور اس طرح نہ صرف یہ کہ قیامت سے انکار کر رہا ہے بلکہ حکمت باری کا بھی منکر ہے اس لیے کہ قیامت کا تعلق ہے اس چیز سے کہ اللہ حکیم ہے اور اس نے ہمیں پیدا کیا ہے تو ایک

دن مقصد تخلیق کے متعلق ہم سے سوال بھی کرے گا۔ قیامت کا انکار اللہ کی حکمت سے انکار، اس کی تمام صفات کمال کے انکار کے مترادف ہے!

سوال یہ ہے کہ کیا جو شخص اللہ کی صفات کمال کا منکر ہو، نبوّت کا منکر ہو، قیامت کا منکر ہو، اسے مسلمان کہا جا سکتا ہے؟

ظاہر ہے کہ عقائد اسلامی کا علم رکھنے والا کوئی شخص ایسی حالت میں یزید کو مسلمان کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا، اب یہی یزید مسلمانوں سے بیعت کا مطالبہ کرتا ہے اور یہ مطالبہ اس شخص تک سے کیا جاتا ہے جو پیغمبرؐ اسلام کا نواسہ اور شریعت اسلامی کا امین ہے۔ ایسی حالت میں حسینؑ کا فرض کیا ہو جاتا تھا؟ کیا وہ خاموش رہتے اور مسلمانوں کو اس کی اجازت دے دیتے کہ وہ ایک ایسے شخص کی بیعت کر لیں جو اصول اسلام کا منکر اور اس اعتبار سے قطعاً کافر تھا؟ کیا وہ مسلمانوں کے دین پر یہ کھلا ہوا حملہ برداشت کر سکتے تھے؟ اور کیا ایسی حالت میں ان پر جہاد واجب نہیں ہو جاتا تھا؟

بلاشبہ یزید ایک عیاش، شرابی، ظالم اور بدکار سلطان تھا لیکن اگر اس میں یہ عیوب نہ بھی ہوتے اور وہ اسلام کے بنیادی عقائد کا منکر ہوتا تب بھی حسینؑ اور ہر سچا مسلمان اس کے خلاف جہاد پر مجبور ہو جاتا اس لیے کہ ایک کافر کو خواہ وہ اخلاقی اعتبار سے کتنا اچھا ہی کیوں نہ ہو رسولؐ کا خلیفہ بن کے مسلمانوں کے ایمان سے کھیلنے کا موقع نہیں دیا جا سکتا اور ایسی حالت پیدا ہو جانے پر ہر مسلمان پر جہاد واجب ہو جاتا ہے!

یہاں سے امام حسین علیہ السلام کے جانشینوں کی روش کو سمجھنا بھی آسان ہو جاتا ہے، امام حسین علیہ السلام کے بعد کسی امام نے جہاد نہیں کیا

حالانکہ ان ائمہ کے دور میں بنی امیہ اور بنی عباس کے بادشاہوں نے ستم رانی عیاشی، شراب نوشی اور بدکاری کے وہ وہ نمونے پیش کیے جن پر یزید کی روح بھی شرما جائے ——— لیکن آل رسولؐ کے محترم ارکان میں سے کسی نے ان سلاطین کے خلاف جہاد نہیں کیا، اس کی وجہ صاف ظاہر ہے یہ سلاطین فسق و فجور میں ضرور مبتلا تھے لیکن اسلام کے بنیادی عقائد سے کھلم کھلا انکار کی جرأت نہیں کرتے تھے، وہ فاسق تھے مگر مسلمان تھے، ایسی حالت میں ان کے خلاف جہاد نہیں ہو سکتا تھا، یزید کھلم کھلا کافر تھا اس لیے امام حسین علیہ السلام نے اس کے خلاف جہاد کیا اور اس جہاد کا اثر یہ ہوا کہ یزید کے بعد جو لوگ بھی تخت خلافت پر فائز ہوئے ان میں سے کسی میں یہ جرأت نہ ہو سکی کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا انکار کر سکے، گویا معرکہ کربلا نے ہر مدعی خلافت کو بظاہر مسلمان بنے رہنے پر مجبور کر دیا اور یہ حسینؑ کا وہ عظیم احسان ہے جسے دنیائے اسلام کبھی فراموش نہیں کر سکتی!

ضد!

بنی امیہ کے حامیان کو معرکہ کربلا کے استخفاف کی جب کوئی راہ نظر نہیں آتی تو وہ اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے ایک یہ اعتراض کر دیا کرتے ہیں کہ امام حسینؑ کو ابن عباس، ابن حنفیہ اور دوسرے کئی حضرات نے سمجھایا تھا کہ آپ عراق نہ جائیں، لیکن امام نے معاذ اللہ ضد سے کام لیا، عراق چلے گئے، موت کے منہ میں خود پھاند پڑے اور اس کے نتیجہ میں شہید ہو گئے، ایسی حالت میں آپ کی شہادت کی ذمہ داری خود آپ کی ضد پر آتی ہے یزید پر نہیں!

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض حضرات نے امامؑ کو عراق جانے اور یزید سے ٹکر لینے سے منع کیا تھا، لیکن ہم بڑے ادب کے ساتھ یہ عرض کریں گے کہ عام انسان کبھی تاریخ ساز انسانوں کے قلب و نظر کی کیفیات، ان کے طریقِ کار اور ان کے اصولِ فکر کا ساتھ نہیں دے سکتے، وہ کنار ساحل کی سلامتی کو بہت قیمتی سمجھتے ہیں، سمندر کا سینہ چیر کے موتی نکالنے والوں کی جرأت نہیں ہوا کرتی، لیکن بڑے آدمی، وہ آدمی جنھوں نے تاریخ عالم کو تابناک بنایا ہے، جن کے کارناموں پر نسل انسانی ناز کرتی ہے، وہ ساحل کی سلامتی کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں، وہ پر شور دریاؤں کی طوفانی

لہروں کا مقابلہ کرتے ہوئے موتی تلاش کرنے میں ہی اپنی عظمت تصوّر کرتے ہیں ، حسینؑ کو "مشورہ" دینے والے وہ عام سطح کے انسان تھے جو نہ عظمت حسینی کا ادراک کر سکتے تھے جو بڑے آدمیوں کا شیوہ ہوا کرتا ہے۔ بنی امیہ کا طرفدار مولوی ، حسینؑ کو بھی اسی سطح کا ادنیٰ انسان تصوّر کرتا ہے ، اور اپنی بزدلی ، کم ہمتی اور کمزوری عزم کے معیار پر حسینؑ کو جانچنا چاہتا ہے ، وہ یہ سمجھنے سے بھی قاصر ہے کہ ایک اعلیٰ مقصد کے مقابلہ میں زندگی کوئی قیمت نہیں رکھتی اور ایک ایسا انسان جو مقاصد کو زندگی سے افضل تصوّر کرتا ہے ایسے مشوروں کو کوئی وقعت نہیں دیا کرتا جن کی اساس موت سے خوف پر قائم ہوا کرتی ہے ، یہی وجہ ہے کہ وہ حسینؑ پر اعتراض کرتا ہے اور اس پر کڑھتا ہے کہ جس طرح وہ موت سے ڈرتا ہے ، جس طرح وہ ہر شے کے مقابلہ میں اپنی جان کی سلامتی کو ضروری تصوّر کرتا ہے، جس طرح وہ زندگی پر سب کچھ قربان کر دینے کے لیے تیار رہتا ہے اسی طرح حسینؑ نے بھی کیوں نہ کیا ؟ اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ حسینؑ کو جان بچانے کا "مشورہ" دیا گیا لیکن انھوں نے اس مشورہ کو قبول نہیں کیا اور ایک بلند تر مقصد پر جان قربان کر دی ، یہ چیز بنی امیہ کے ہوا خواہ ملاؤں کے لیے سخت پریشانی کا موجب ہے اور ہمیں اس معاملہ میں ان سے پوری ہمدردی ہے اس لیے کہ ہم یہ جانتے ہیں کہ یہ بے چارے عام سطح کے کمزور اور بزدل انسان اس عظمتِ فکر و نظر کا ادراک کیسے کر سکتے ہیں جو حسینؑ کے سے تاریخ ساز انسان میں پائی جاتی تھی !

یہ بے چارے تو اس پر بھی معترض ہوں گے کہ لینن نے زار کے مقابلہ کی ٹھان لی ، بوریہ نشین گاندھی انگریزوں کے مقابلہ میں

اٹھ کھڑا ہوا، کمال اتاترک نے اتحادی طاقتوں کو چیلنج دے دیا، ماؤزی تنگ، چیانگ کے مقابلہ میں صف آرا ہو گیا، شمالی کوریا کے نہتے عوام نے امریکیوں کے مقابلہ کا اعلان کر دیا، انڈونیشیا کے باشتیے ولندیزیوں کے خلاف صف آرا ہو گئے، ان سب کو مشورہ دیا گیا کہ کیوں مفت میں اپنی جان کھوتے ہو؟ کیوں بڑی بڑی طاقتوں کے مقابلہ میں آتے ہو؟ کیوں سلحشور حکومتوں کا مقابلہ کرتے ہو؟ اپنے اپنے گھروں میں بیٹھو، بیوی بچوں سے دل بہلاؤ، چین سے زندگی بسر کرو، لیکن ان میں سے کسی نے اموی مکتب فکر کے پروردہ ملّا کے فلسفۂ سکون کو تسلیم نہیں کیا اور سروں کو ہتھیلیوں پر رکھ کر آزادی اور انصاف کے لیے لڑ گئے، اموی مولوی ان سب کو ضدی قرار دے گا، لیکن مشکل یہ ہے کہ دنیا انہیں ضدیوں کو نسلِ انسانی کا محسن مانتی ہے اور اموی ملّاؤں سے زیادہ عزت و وقعت کا مالک تصوّر کرتی ہے!

بات دراصل یہ ہے کہ لینن، قائداعظم، گاندھی، ماؤ، ناصر، ہوچی مینہ سوکارنو اور اتاترک بڑے آدمی تھے، ان کا انداز فکر اموی مولوی سے مختلف تھا، ان کے نزدیک "سلامتی" ایک حرف بے معنی تھی اور مقصد ایک بلند و برتر شے، اس لیے انھوں نے سلامتی کا مشورہ دینے والے بزدلوں کو ٹھکرا دیا اور دلیر انسانوں کی طرح اپنے مقاصد کے لیے سینہ سپر ہو گئے، انھوں نے بزدلی اور عافیت پسندی کا مظاہرہ کیا ہوتا تو دنیا میں کوئی ان کو جانتا تک نہیں، ان کو نہ شہرت ملتی، اور نہ بقائے دوام کے تاج، وہ خطروں سے کھیلے، خون کے دریاؤں میں پیرے، مصائب کے طوفانوں سے گذرے، موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے مسکرائے، مصائب کے پہاڑوں سے ٹکرائے،

اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انھوں نے نسل انسانی کی تاریخ کا دھارا موڑ دیا ، وہ تاریخ ساز کہلائے اور دنیا نے ان کے قدموں میں آنکھیں بچھا دیں ، اگر وہ بنی امیہ کے ہوا خواہ اور یزید کے وکیل مولوی کے فلسفہ پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اپنی جان اور سلامتی کا خیال کرتے تو تاریخ میں ان کا نام و نشان بھی نہ ہوتا ، ان کی جو کچھ عزّت ہے وہ اسی لیے ہے کہ انھوں نے سلامتی کے مشورے ٹھکرا دیے اور ان بزدلانہ مشوروں کو ٹھکرانے کی قیمت ہی وہ عزت اور شہرت ہے جو آج ان کو نصیب ہے !

یہ تو دنیا دار آدمی کی بات ہوئی ، اب ذرا مذہبی آدمیوں کی فہرست پر بھی نظر ڈال لیجے !

اگر نوحؑ سلامتی کی فکر کرتے اور طوفان کی لہروں سے نہ کھیلتے، اگر ابراہیمؑ آذر کا مشورہ مان کر لپکتے ہوئے شعلوں کے مقابلہ پر تیار نہ ہوتے ، اگر موسیٰؑ بزدل اسرائیلیوں کا مشورہ قبول کرکے فرعون سے ٹکر نہ لیتے ، اگر مسیحؑ یہودیوں کی بات مان کے قیصر کی طاقتوں کے مقابلہ میں صف آرا نہ ہو جاتے ، اگر کرشن کنس کی قوتوں سے مرعوب ہو کر گوپیوں میں زندگی بسر کر دیتے ، اگر گوتم اپنے راج محل کا سکون چھوڑ کے جنگل جنگل کی خاک نہ چھانتے اور اگر محمدؐ قریش کے مقابلہ کا خیال ترک کرکے صرف تجارتی قافلوں کی سربراہی میں مصروف رہتے ، تو ان کو لازماً وہ سکون اور سلامتی نصیب رہتی جسے اموی مولوی ایک نعمت غیر مترقبہ تصوّر کرتا ہے ، لیکن یہ ضرور ہوتا کہ ان بزرگوں نے جو ادیان پھیلائے ، خدا پرستی کے جو درس دیے ، نسلِ انسانی پر جو احسان فرمائے اور انسانیت کو جہل کی ظلمت سے نکال کے دین کی روشنی میں ترقی کرنے کے

جو مواقع عنایت فرمائے ان کا وجود نہ ہوتا اوران بزرگوں کا نام بھی دنیا میں کوئی نہ جانتا ، ان کی ساری عظمت اسی میں ہے کہ انھوں نے ایک بلند تر مقصد کے لیے سلامتی اور زندگی کی نعمتوں کو ٹھکرا دیا اور خطرات و مصائب کی آغوش میں بیٹھ کر نسلِ انسانی کی صلاح و فلاح کا کارنامہ انجام دیا ـــــ اموی ملّا کے نزدیک ان کا رویہ غلط سہی لیکن آج اگر ان کے نام زندہ ہیں ، آج اگر ان کا ذکر عزت کے ساتھ ہوتا ہے ، آج اگر دنیا ان کے سامنے سرِ نیاز خم کرتی ہے تو اس کی وجہ یہ اور صرف یہ ہے کہ انھوں نے سکون و سلامتی کے مشوروں کو ٹھکرا کے ، اپنی قیمتی جانوں کو تہلکہ میں ڈال کے نسلِ انسانی کی ہدایت کا فریضہ انجام دیا تھا !

حسینؑ کے سامنے بھی ایسی ہی صورت تھی ، ان کے سامنے زندگی بھی تھی اور ایک اعلیٰ مقصد بھی ، انھوں نے مقصد پر زندگی کو قربان کر دیا ، یہی ان کی عظمت کا ثبوت ہے ، انھوں نے جان بچانے کے بزدلانہ مشوروں کو قبول نہیں کیا اس لیے کہ یہ مشورے عام سطح کے انسانوں کو محبوب ہوتے ہیں ، اعلیٰ سطح کے انسانوں کی نظر میں ان بزدلانہ مشوروں کی کوئی وقعت نہیں ہوتی ، حسینؑ ایک اعلیٰ سطح کے انسان تھے ، سچ تو یہ ہے کہ وہ فوق البشر تھے ، ان کی نگاہ میں ان مشوروں کی کیا قیمت ہو سکتی تھی ؟ چنانچہ انھوں نے سکون کے مقابلہ میں طوفان کو اور سلامتی کے مقابلہ میں موت کو ترجیح دی اور آج اسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں ان کا نام احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے !

جان بچانے کا مشورہ جہاں بزدلی کا مظہر ہوتا ہے وہیں کوتاہی

فکر و نظر کا بھی ثبوت ہوتا ہے، حسینؑ کو جان بچانے کا مشورہ دینے والے یہ چاہتے تھے کہ چھپن سالہ حسینؑ اور دس بیس سال زندہ رہ کر طبعی موت مرجائیں اور اس طرح مرجائیں کہ ان کے جسم کے ساتھ ان کا ذکر بھی دفن ہو جائے! لیکن حسینؑ جن کی فکر آسمانوں کو چھوتی تھی، جن کی نگاہیں عرش کا طواف کرتی تھیں، جن کا تخیل زمان و مکان کی وسعتوں کو اپنے دائرہ میں سمیٹے ہوئے تھا، اور جن کا ذہن موت کے طلسم کو پاش پاش کر ڈالنے کی قوتوں کا مالک تھا، محض دس بیس سال تک زندہ رہنے اور پھر مرجانے پر تیار نہیں ہو سکتے تھے، وہ جینے کے لیے نہیں مرتے تھے مر کے جینا چاہتے تھے، وہ زندگی پر قربان ہونا غیر ضروری تصور کرتے تھے، وہ زندگی کو فتح کرنا، تسخیر کرنا چاہتے تھے، وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ زندگی کے در کا طواف کریں بلکہ یہ چاہتے تھے کہ زندگی خود ان کے در کا طواف کرے، مشورہ دینے والوں کی کوتاہ نظری ان کو دس بیس سال زندہ رہنے کی دعوت دے رہی تھی اور وہ حیات ابدی سے کم پر راضی نہیں ہو سکتے تھے، اس لیے انھوں نے اس کوتہ فکر اور کوتہ نظر طبقہ کا مشورہ مسترد کر دیا جو ان کو محض چند سال زندہ رہنے کی دعوت دے رہا تھا اور اس شاہراہ شہادت پر گامزن ہو گئے جس کے نتیجہ میں انکی حیاتِ ابدی قربان ہو رہی ہے، یہ حسینؑ کی بلند نظری اور فکر عرش پیما کا ایک مظاہرہ تھا، ظاہر ہے کہ مشورہ دینے والے نہ اس بلندی فکر کے مالک تھے اور نہ موت و حیات کے رازوں کے اس درجہ واقف کار، جتنے حسینؑ تھے، اس لیے ان بے چاروں نے وہ مشورہ دے دیا جو ان کے ظرف اور ان کی فکر کے مطابق تھا، حسینؑ نے وہ کیا جو اُن

کے ظرف اور ان کی فکر کے مطابق تھا اور نتیجہ صاف نظر آ رہا ہے حسینؑ گھر میں بیٹھے رہتے تو دس بیس سال اور زندہ رہتے، مر جاتے تو ان کا نام بھی مر جاتا، زیادہ سے زیادہ زندگی ملتی تو چند سال کی، لیکن حسینؑ نے جو راہ عمل اختیار کی اس کے نتیجہ میں ان کو حیاتِ ابدی اور دائمی عزت حاصل ہو گئی جو ان کی دور بین فکر اور ان کے بے پناہ عمل کا نتیجہ ہے!

اموی ملّا حسینؑ کو اپنے معیار پر جانچنا اور اپنے پیمانہ پر ناپنا چاہتا ہے، اس کے نزدیک دو دن کی زندگی قیمتی ہے اس لیے وہ چاہتا ہے کہ حسینؑ بھی اس چند روزہ حیات کی قدر کرتے، لیکن اس کی بدقسمتی کہ حسینؑ کی منزل اس کی حد ادراک سے بلند ہے اس لیے حسینؑ کا عمل اس کے عمل سے، حسینؑ کا انداز اس کے طریق کار سے اور حسینؑ کی فکر بلند اس کی ادنیٰ فکر سے مختلف ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ جھنجھلاتا ہے، کڑھتا ہے، کوفت محسوس کرتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ حسینؑ کو اپنی سطح تک نیچے گھسیٹ لائے یا کم از کم دنیا کو اس پستی فکر کا قائل کر دے جس میں وہ خود مبتلا ہے تاکہ دنیا حسینؑ کی بلندیٔ فکر اور بلندی منزلت کا احساس ترک کر دے، لیکن وہ تیرہ سو سال سے ان دونوں منصوبوں میں ناکام ہے اور ہمیشہ ناکام رہے گا، نہ وہ حسینؑ کو ضدی کہہ کر ان کی منزلت کو کم کرنے میں کامیاب ہوگا اور نہ سلامتی کے مہمل فلسفہ کو منوا کے انسانی عظمت کی راہ میں سنگ گراں حائل کر سکے گا، دنیا نے ہمیشہ مقاصد کی خاطر خطرات کو دعوت دینے والوں کی عزت کی ہے اس لیے دنیا ہمیشہ حسینؑ کی عزت کرتی رہے گی، دنیا نے ہمیشہ شہیدوں کی حیاتِ ابدی کا اقرار کیا ہے اس لیے زندگی ہمیشہ حسینؑ پر قربان ہوتی رہے گی اور بزدلی، کوتہ نظری اور کم فہمی کی

اساس پر معرکۂ کربلا پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں، وہ جس طرح ہمیشہ بے اثر رہے ہیں اسی طرح آیندہ بھی بے اثر رہیں گے اس لیے کہ نہ حسینی عظمت اس پست سطح پر اتر سکتی ہے جس پر بنی امیہ اسے لانا چاہتے ہیں اور نہ وہ ان احمقانہ اعتراضات کو درخور اعتنا تسلیم کر سکتی ہے جو بنی امیہ کے طرف دار حسینؑ پر کرتے رہتے ہیں، انسان فطرتاً بلندی نظر اور بلندی فکر کا شیدا ہوتا ہے، جرأت اور شجاعت کا ودائی ہوتا ہے، اعلیٰ مقاصد پر جان قربان کرنے والوں کی قدر کرتا ہے اس لیے حسینؑ کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا اور سکون و عافیت کے مشوروں کی قدر نہ کرنے کے الزامات لگانے والے فنا ہو جائیں گے، لیکن سکون و عافیت کے مشوروں کو ٹھکرا دینے والے حسینؑ کا نام تاریخ انسانی میں ایک بیش بہا ہیرے کی طرح ہمیشہ جگمگاتا نظر آئے گا!

وضعی حدیثیں

حسینؓ کے دشمنوں نے حسینؑ کی یادگار مٹا دینے کے لیے جہاں جبر و تشدد کا ہر امکانی حربہ استعمال کیا، وہیں مذہب کو بھی آلۂ کار بنایا، چنانچہ ہمارے ہندوستان میں تو آج بھی یہ رسم موجود ہے کہ ادھر ہلالِ محرم فلک پر نمایاں ہوا، ادھر شہروں میں بڑے بڑے پوسٹر چسپاں ہو گئے، اخباروں میں مضامین چھپنا شروع ہو گئے اور علماء نے اعلانات شروع کر دیے کہ

عاشورہ کے دن آدمؑ کی توبہ قبول ہوئی تھی
عاشورہ کے دن کشتی نوحؑ کوہ جودی پر ٹھہری تھی
عاشورہ کے دن ابراہیمؑ پر آگ گلزار ہوئی تھی
عاشورہ کے دن موسیٰؑ کے لیے دریائے نیل پھٹا تھا
عاشورہ کے دن یونسؑ نے بطن ماہی سے نجات پائی تھی

غرض یہ کہ دنیا بھر کے خوشی کے واقعات عاشورہ کے دن ظہور میں آئے تھے!

اگر یہ پوچھیے کہ حضور والا! یہ واقعات کن تاریخوں سے ثابت ہیں؟ دنیا کی کس تاریخ میں یہ واقعات مندرج ہیں، ان ارشاداتِ گرامی کی صحت کن بنیادوں پر ثابت کی جا سکتی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ

"حدیث شریف"

میں ان اہم واقعات مسرت کی یہ تاریخ بتلائی گئی ہے اور اگر یہ پوچھ جائے کہ ان احادیث شریفہ کی صحت کی دلیل کیا ہے ؟ ان کے رواۃ کہاں تک قابلِ اعتبار ہیں ؟ ان کے مندرجات کو رجال اور درایت کے اصول پر کہاں تک ثابت کیا جا سکتا ہے ؟ تو اس کا جواب کسی کے پاس نہیں !

بات در اصل یہ ہے کہ بنی امیہ نے آلِ رسولؐ کی مخالفت میں جہاں اور سینکڑوں جھوٹی احادیث وضع کرائیں وہیں یہ مجموعۂ خرافات بھی ایجاد کر دیا ورنہ ظاہر ہے کہ

آدمؑ کی توبہ کی تاریخ ، موسیٰؑ کے لیے دریائے نیل پھٹنے کی تاریخ ، نار نمرودی کے گلزار ہونے کی تاریخ ، نوحؑ کی کشتی کوہ جودی پر ٹھہرنے کی تاریخ نہ کسی کو معلوم ہے اور نہ معلوم ہو سکتی ہے ، رہا یہ کہ پیغمبرؐ کو یہ تاریخ معلوم تھی تو عہد نبوی میں عاشورہ کو وہ اہمیت حاصل نہیں تھی جو معرکۂ کربلا کے بعد حاصل ہوئی ، اس لیے رسول اکرمؐ کو اس تاریخ کے " فضائل " گنانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی ، دوسرے پیغمبر دنیا کو ایک نیا دستور حیات اور ایک نئی شریعت دینے کے لیے مبعوث ہوئے تھے ، اقوام قدیم کی تاریخ پڑھانے کے لیے نہیں آئے تھے جو وہ واقعہ کا دن ، تاریخ بیان فرماتے رہے ، اور اگر یہ مان لیا جائے کہ پیغمبرؐ کے فرائض میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ اقوام و ملل قدیمہ کی تاریخ مسلمانوں کو پڑھائیں ، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے صرف ان واقعات کی تاریخ کیوں بتلائی جو عاشورہ کے دن ہوئے تھے ، دوسرے واقعات کے دن تاریخ کیوں نہ بتلا گئے ؟ یہ ایسے سوالات ہیں جو ہر دل میں پیدا ہوتے ہیں ، لیکن ان کا کوئی جواب نہیں دیا جاتا اور محض تعصب اندھا دھاندلی کے بل پر ہر سال اس مجموعۂ خرافات کو چھاپ دیا جاتا ہے!

جو "مجاہدینِ اسلام" ان خرافات کو پوسٹروں کی شکل میں چھاپ کے گلی کوچوں میں چپکاتے رہتے ہیں اور اسے اپنی سب سے بڑی "اسلامی خدمت" تصور کرتے ہیں وہ یہ بھولتے ہیں کہ ان پوسٹروں سے متاثر ہوکر ایک آدمی بھی حسینؑ کی یاد منانا ترک نہیں کرتا، ایک تعزیہ بھی کم نہیں ہوتا، ایک ماتم دار بھی ترک ماتم نہیں کرتا، ایک امامباڑہ پر بھی قفل نہیں چڑھتا، البتہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ جب غیر مسلم ان پوسٹروں کو پڑھتے ہیں تو ان کی نگاہ میں پیغمبرؐ اسلام ذلیل ہوتے ہیں، اسلام ذلیل ہوتا ہے اور مسلمان ذلیل ہوتے ہیں، اس لیے کہ ان غیر مسلموں کے ذہن میں فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو مذہب آدمؑ کی توبہ کی تاریخ اور کشتی نوحؑ کوہ جودی پر ٹھہرنے کی تاریخ، بغیر کسی ثبوت و شاہد کے دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے اور اس قسم کے اوہام و خرافات کو اس عقل و روشنی اور تحقیق کے دور میں دنیا سے منوانا چاہتا ہے وہ مذہب، اس کا لانے والا اور اس کے ماننے والے کس درجہ کے لوگ ہوں گے!

ظاہر ہے کہ ہم کسی غیر مسلم سے یہ نہیں منوا سکتے کہ آدمؑ کے زمانہ میں قمری سال رائج تھا اور اس سال کے مہینوں کے وہی عربی نام تھے جو آج مروّج و متداول ہیں، اور پھر محرم کے مہینہ کی دسویں تاریخ کو آدمؑ کی توبہ قبول کی گئی تھی ——— یہ باتیں خوش عقیدہ اور جاہل مسلمان تو مان سکتے ہیں، لیکن غیر مسلم تو کیا، پڑھے لکھے مسلمان بھی ان کو ماننے پر تیار نہیں ہو سکتے، ایسی حالت میں اس قسم کی خرافات کو پیغمبرؐ اسلام سے منسوب کرنا اور پھر اسے شاہراہوں پر شائع اور چسپاں کرنا اسلام اور بانی اسلام کو ذلیل کرنے کے علاوہ اور کوئی معنی نہیں رکھتا!

سوال یہ ہے کہ کیا حسینؑ کی یادگار کو مٹانے کے لیے اسلام اور بانی اسلام کی اس طرح توہین کرنا کوئی اسلامی خدمت کہی جا سکتی ہے ؟

ایسی ہی خلافِ عقل و درایت روایات نے نہ صرف یہ کہ غیر مسلموں کو اسلام پر طعنہ زن ہونے کا موقع عطا کیا ہے بلکہ خود پڑھے لکھے مسلمانوں کو حدیث کی جانب سے مشتبہ کر دیا ہے جس کا ایک نتیجہ آج فتنہ انکار حدیث کی شکل میں برآمد ہو رہا ہے !

شہیدِ انسانیت

علامہ علی نقی مرحوم کی یہ معرکتہ الآرا کتاب حضرت امام حسین علیہ السلام کی زندگی اور شخصیت پر کامل اور مدلل روشنی ڈالتی ہے۔ اس کتاب میں امام مظلوم کی پیدائش سے قبل عرب کی سیاسی، ثقافتی اور مذہبی حالت کا نقشہ کھینچکر ان تمام حالات کا تذکرہ کیا گیا ہے، جن میں امام حسین علیہ السلام کی زندگی پروان چڑھی، پھر معاویہؓ اور یزید کی ان ریشہ دوانیوں کا بھی ذکر ہے، جو آلِ محمدؐ کے خلاف روا رکھی گئیں۔ واقعۂ کربلا کے اسباب و نتائج پوری بصیرت اور وضاحت کے ساتھ درج ہیں اور تقریباً ایکسو پچیس ۱۲۵ انصارِ حسینؑ کے حالاتِ زندگی بھی بڑی تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ آخر میں حضرت امام حسین علیہ السلام کی سیرتِ طیبہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چھ سو صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت کم سے کم ۱۸۰/۰۰ روپے رکھی گئی ہے۔

معراجِ انسانیت

علامہ مرحوم کی یہ کتاب بھی ہمیں بتاتی ہے کہ اس دنیا میں انسان کیوں آیا۔ اسکے حقوق اور فرائض کیا ہیں اور اسے کیوں انسانِ کامل کہا جاتا ہے۔ علامہ نے اُن تمام اصولوں کا تذکرہ کر کے بتایا ہے، جن پر عمل پیرا ہو کر انسان کو معراج حاصل ہوتی ہے۔ علامہ نے تشریح کی ہے کہ جدّت انسان کو بے راہروی کیطرف بہالے جاتے ہیں لیکن اگر اس میں فرض شناسی کا جذبہ موجزن ہو تو اس سے عدل و اعتدال کی راہِ مستقیم بن جاتی ہے۔ اسی اصول کے تحت سیرتِ محمدؐ و آلِ محمدؐ کی چند جھلکیاں پیش کی گئی ہیں تاکہ انسان انہیں دیکھ کر اور ان پر عمل کر کے راہِ نجات حاصل کرے۔ ایک سو صفحات اور قیمت صرف: ۲۰/۰۰ روپے ہے۔

نگارشاتِ سیّد العلماء

علّامہ سیّد علی نقی مرحوم کے اندازِ تحریر اور ندرتِ افکار کا ایک زمانہ قائل ہے۔ آپ نے اپنی زندگی میں تقریباً تین سو کتابیں تصنیف کیں۔ امامیہ مشن پاکستان نے آپ کے اکثر مضامین کو کتابچوں کی صورت میں شائع کیا لیکن وہ تمام الگ الگ رسائل اور کتابچے اب مومنین کے پاس محفوظ نہیں۔ اسلئے ضروری سمجھا گیا کہ ان تمام متفرق مضامین کو کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے۔

اس اہم کتاب میں علّامہ مرحوم کے ۲۴ نایاب مضامین شائع کر دیئے گئے ہیں۔ ان مضامین کا اصولِ دین، فروعِ دین اور دیگر اسلامی ثقافت و تہذیب سے تعلّق ہے۔ جنھیں پڑھکر ایک عام آدمی خدا، رسولؐ اور اہلبیت اطہار کی مرضی اور منشا سے کماحقہٗ واقف ہو جاتا ہے۔ شیعی تہذیب و ثقافت پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں، اُن کے مدلّل جوابات قرآن اور احادیث کی روشنی میں دیئے گئے ہیں۔ کتاب صرف ایک ہزار شائع ہوئی ہے۔ عمدہ کتابت، سفید کاغذ اور دیدہ زیب ٹائیٹل کی موجودگی میں تین سو چراسی (۳۸۴) صفحات پر مشتمل اس کتاب کا ہدیہ نہایت کم ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ امامیہ مشن پاکستان ۳۳/ بی شمع پلازہ فیروز پور روڈ لاہور اور افتخار بکڈپو مین بازار اسلام پورہ لاہور

اُسوۂ حسن

اس کتاب کے مصنّف علّامہ علی حسنین شیفتہ ہیں۔ علّامہ مرحوم نے تقریباً ۱۰۰ کتابوں کے حوالوں سے امامؑ کی لازوال امامت کا تذکرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ بنی امیّہ کی جھوٹی اور وضعی حدیثوں کی مدد سے رسولِ پاک کے اس بڑے نواسے کی کردار کشی کی گئی ہے۔ پوری کتاب میں صفحات کے نیچے فٹ نوٹ دیئے گئے ہیں تاکہ مصنّف کی تحریر باوزن ہو جائے۔ اس کتاب کے صفحات ۳۱۲ ہیں اور قیمت صرف پچاس روپے ہے۔

متعہ اور اسلام

سید العلماء مولانا علی نقی مرحوم کی یہ نادر اور نایاب کتاب امامیہ مشن پاکستان نے عدم مالی استطاعت رکھتے ہوئے عوام الناس کے فائدے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے شائع کر دی ہے۔ علامہ مرحوم نے اس کتاب میں قرآن اور حدیث کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ اگر متعہ کو منقطع نہ کیا جاتا تو عالمِ اسلام میں کوئی شخص زنا کا مرتکب نہ ہوتا۔ آخر میں مولانا مودودی مرحوم کا فتویٰ بھی دیا گیا ہے۔ بہترین گٹ اپ کے ساتھ یہ کتاب کم دام پر دستیاب ہے، ہدیہ: ۵۰/۰۰ روپے ہے۔

کربلا کی شیر دل خاتون

امامیہ مشن پاکستان کی یہ لاجواب کتاب اب چھٹی بار شائع ہوئی ہے۔ اردو میں جناب زینبؑ کی اس سے بہتر کتاب موجود نہیں ہے۔ کم تعداد میں طبع ہونے کی وجہ سے جلد از جلد خرید لیں، ورنہ پھر پچھتانا پڑے گا۔ ڈاکٹر عائشہ مصری نے یہ کتاب تصنیف کی ہے اور سید محمد عباس زیدی نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ عمدہ کاغذ، بہترین کتابت اور عمدہ جلد کے ساتھ کم سے کم قیمت ۷۰/۰۰ روپے رکھی گئی ہے۔

دین و اسلام

یہ کتاب علامہ شیخ محمد حسین آلِ کاشف الغطا کی تصنیف ہے۔ اصولِ دین سمجھنے کیلئے اس کتاب کا ہر گھر میں ہونا نہایت ضروری ہے۔ نہایت شستہ اور آسان زبان میں خدا کی وحدانیت، رسالت اور مسئلہ امامت کا ذکر کیا گیا ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ دینِ اسلام کا نظام عقل پر منحصر ہے۔ چند فرقوں کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے جو خدا کی بعض صفات میں شک کرتے ہیں۔ اس کتاب کے صفحات ۲۲۸ ہیں اور قیمت: ۳۰/۰۰ روپے ہے۔

دینِ حق

آقائے سیّد شرف الدین کی یہ نایاب کتاب ہے۔ اس کتاب میں وہ ۵۴ خطوط ہیں جو آقائے شرف الدّین اور عالمِ اہلِ سنّت شیخ سلیم البشری کے مابین تحریر ہوئے اور پھر یہ فیصلہ ہوا کہ امّت کے اتّحاد کا بنیادی اصُول یہی ہے کہ کتاب اللہ اور اہلِ بیتؑ کا تتبع کیا جائے۔ کتاب ۳۲۴ صفحات پر مشتمل ہے اور قیمت: ۱۰۰/۰۰ روپے ہے بشر

اعجاز التنزیل

یہ کتاب خلیفہ محمد حسن خان بہادر مرحوم کی تصنیف ہے، جس میں موصوف نے عرب کی حالت، حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی سیرت، قرآن مجید کی خوبیاں، اسلام اور غلامی، مذہب کی آزادی، حضورؐ کے غزوات، جزیے کی حقیقت، طلاق اور تعداد ازواج، دینِ قیّم اور متعدّد پیش گوئیوں کا تذکرہ کیا ہے۔

صفحات: ۴۴۰ اور قیمت: ۴۵/۰۰ روپے

فتحِ مُبین

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کی یہ کتاب بنی امیّہ کے مدح خوانوں کے دلائل کا مسکت جواب ہے۔ اس کتاب میں مصنّف نے روایت و درایت کے ساتھ بنی امیّہ کے مقابلے میں آلِ محمدؐ کی فتحِ مبین کو قلم کی پوری توانائیوں کے ساتھ اس دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے کہ آلِ محمدؐ کے کردار کی عظمت و لازوال فتح کا اقرار کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں۔ ۳۱۲ صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت: ۱۲۰/۰۰ روپے ہے بشر

دینیات (اوّل تا پنجم)

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کے تبحرِ علمی کا ہر مومن معترف ہے۔ آپ نے دس سال کی عمر تک کے بچّوں کے لئے دینیات کا ایک عظیم الشان سیٹ تحریر کیا ہے۔ اس بے حیائی اور گمرہی کے دَور میں ٹی۔ وی کی تباہ کاریوں سے اپنے بچّوں کو محفوظ رکھنے کیلئے ضروری ہے کہ اپنے بچّوں کو ان کتابوں کا مطالعہ کرائیں۔ یہ کتابیں نہایت عام فہم اُردو زبان میں تحریر کی گئی ہیں اور بچّوں کی نفسیات کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ پورا سیٹ مکمل کرنے کے بعد بچّہ دین اسلام کی اہم باتوں سے بخوبی واقف ہو جاتا ہے۔ امامیہ مشن پاکستان نے قوم کے بچّوں کو بے راہروی سے بچانے کیلئے پانچ کتابوں کا یہ سیٹ شائع کیا ہے جس کا ہدیہ صرف ۵۰/۰۰ روپے ہے۔ مشن کے ممبروں کو ۲۰ ٪ کی رعایت دی جاتی ہے۔

(امامیہ مشن پاکستان ۳۳/بی شمع پلازہ، فیروزپور روڈ، لاہور)

فکرِ انیس

پروفیسر عابد علی عابدؔ اور مولانا مرتضیٰ حسین فاضل مرحومین نے انیسؔ کے چند مرثیوں کو اس ترتیب سے مدون کیا ہے کہ تمام مرثیے ایک ہی بحر میں ہیں۔ اور حضرت امام حسینؑ اور اہلبیت اطہار کے جملہ واقعات بالترتیب بیان کئے گئے ہیں۔ ایّامِ عزا میں اپنی مجالس میں ان دلدوز مرثیوں کو پڑھیئے اور جنابِ فاطمہ زہراؑ کو ان کی آل کا پرسہ دیں۔ کم از کم ہدیہ چالیس روپے ہے۔ مشن کے ممبروں کو ۲۰ ٪ رعایت دی جاتی ہے۔

(امامیہ مشن پاکستان، لاہور)

مراثی سیّد آلِ رضاؔ

بیس سال قبل سیّد آلِ رضاؔ مرحوم کے مراثی کا یہ مجموعہ شائع ہوا تھا۔ اس عرصے میں مرحوم کی اس کتاب کے تمام نسخے ختم ہو گئے۔ امامیہ مشن پاکستان لاہور کے پاس اس کتاب کے چند نسخے موجود ہیں۔ مرحوم کے مراثی کی زبان نہایت صاف اور شستہ ہے اور تمام مرثیوں میں تعقل اور استدلال سے کام لیا گیا ہے۔ چونکہ مرحوم خود ایک اعلیٰ اور مشہور وکیل تھے، اس لئے انکے بیان میں خلافِ واقعہ اِدھر اُدھر کی باتیں نہیں در آ سکیں۔ مجموعے میں بیس نایاب مرثیے ہیں۔ عمدہ کتابت، سفید کاغذ اور صادقین کے موقلم سے آراستہ ٹائیٹل ہے۔ قیمت صرف تنو روپے ہے۔ ممبروں کو ۲۰٪ رعایت دی جاتی ہے ۔

ماہنامہ "پیامِ عمل" لاہور

یہ ماہنامہ امامیہ مشن پاکستان کا آرگن ہے۔ پہلا رسالہ ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا تھا اور اب تک بڑی پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ اس رسالے کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ یہ روزِ اوّل سے اسلامی اتحاد کا حامی رہا ہے اور اس میں آج تک تفریقِ رنگ و نسل و لسان پر مبنی کوئی مضمون شائع نہیں کیا گیا ۔ ہمیشہ محمدؐ و آلِ محمدؐ کی سیرت و کردار کا جائزہ پیش کیا گیا۔ اس رسالے کے کئی اعلیٰ نمبر بھی شائع ہوئے، جن میں انیس نمبر اور حافظ کفایت حسین نمبر بہت مقبول ہوئے۔ کوشش کیجاتی ہے کہ رسالے سے ادب کی شان پیوستہ رہے اور تازہ بہ تازہ نو بہ نو مضامین اسمیں شائع ہوں ۔ رسالے کا سالانہ چندہ صرف تنو روپے ہے۔

نگارشات سیّد العلماء

از سیّد العلماء الحاج علّامہ سیّد علی نقی مرحوم و مغفور

۲۴۔ نادر و نایاب مقالات پر مبنی

یہ کتاب جدید ذہن کے نوجوانوں کے لیے بیحد
مفید ہے ہر مومن کے گھر میں اس کتاب کا ہونا
ضروری ہے

صفحات ۳۹۲ ہدیہ ۱۵۰/- روپے

ناشر

اِمامیہ مشن پاکستان ٹرسٹ

۲۲۔ بی شمع پلازہ، ۷۲۔ فیروز پور روڈ، لاہور

80